

انیس

کی

شاعرانہ بصیرت

سیّد مشکور حسین یاؔد

کلاسیک

میر انیس

کی شاعرانہ بصیرت

(مطالعہ انیس کے چند نئے پہلو)

مشکور حسین یاد

کلاسیک

42- دی مال، لاہور

بارِ اوّل: فروری 2003ء

قیمت:-/150 روپے

ناشر: آغا امیر حسین
کلاسیک، چوک ریگل (مال) لاہور
فون: 7312977 فیکس: 7323963
ای میل: classic_spt@hotmail.com
طابع: زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

انتساب

انیس کے وسیع المشرب قارئین

کے

نام

کہ مطالعۂ انیس کی پہلی حیران کن شرط وسیع المشربی ہے

شکر ہی شکر نکلتا تھا لہو کے بدلے
دہنِ زخمِ بدن دیدۂ خونبار نہ تھے

انیسؔ

فہرست مضامین

دیباچہ

اوّل تو بصیرت کا لفظ ہی کوئی کم اہم نہیں پھر بصیرت بھی کیسی' شاعرانہ' گویا بات مزید اہم ہو گئی اس سے بھی آگے کی بات یہ کہ شاعرانہ بصیرت بھی کس کی' میرانیس کی۔ اس طرح میری اس کتاب کا نام ''میر انیس کی شاعرانہ بصیرت'' خاصہ گمبھیر ہے۔

آپ جانتے ہیں بصیرت کا پہلا کام ہماری بصارت کی اہمیت کو ہم پر واضح کرنا ہے۔ ورنہ آنکھیں تو خدا نے سب کو دی ہیں۔ کتنے افراد ہیں جو اپنی ان آنکھوں سے صحیح معنی میں کام لیتے ہیں۔ حالانکہ ارشاد خداوندی کے تحت ہر انسان نہ صرف اپنی بصارت سے صحیح معنی میں کام لے سکتا ہے بلکہ وہ تو اپنے نفس' اپنی ذات کی بصیرت بھی رکھتا ہے۔ سورہ قیامت کی آیت ۱۴ میں ہے بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرہ۔انسان اپنے نفس پر بصیرت رکھتا ہے۔ گویا انسان کو بصیرت کی صلاحیت تو پہلے ہی سے دی گئی ہے۔ اسے تو اس ضمن میں بس معمولی سی توجہ کی ضرورت ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ معمولی سی توجہ

اس لئے غیر معمولی بن جاتی ہے کہ اس معمولی سی توجہ کے نتائج بہت غیر معمولی ہوتے ہیں۔ اور انسانی نفسیات کا یہ پہلو بہت ہی عجیب ہے کہ وہ اپنے معمول کو آگے تو بڑھانا چاہتا ہے اس کی ارتقا کا بھی خواہاں رہتا ہے لیکن معمول کو غیر معمولی نہیں ہونے دیتا۔ اور یوں یہ ذرا سی توجہ بہت بڑی توجہ بن جاتی ہے کہ جلدی سے عمل میں نہیں آتی۔ یعنی اس معمولی سی توجہ سے کام نہیں لیا جاتا۔

ورنہ آپ جانتے ہیں بصیرت کے معنی بات کو سمجھنا ہے' اس کی تہہ تک پہنچنا ہے' اس کے امکانات کو اپنی نظر میں رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ کوئی بات جتنی معمولی ہوتی ہے اس پر اسی نسبت سے غیر معمولی توجہ ڈالی جاتی ہے۔ غیر معمولی ان معنی میں کہ اسے کسی طرح بھی فراموش نہ کیا جائے۔ ہر انسان صاحب بصیرت ہوتا ہے۔ بصیرت کے حوالے سے خاص ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اچھی طرح سمجھا جائے اور یوں بصیرت کا براہ راست تعلق زبان سے استوار ہو جاتا ہے۔ گویا اس ضمن میں جو کچھ ہے وہ زبان کا ہے۔ زبان نہ ہو تو بصیرت کے کچھ ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بصیرت کے ضمن میں انسان کا جو کچھ کیا دھرا ہوتا ہے وہ زبان کی بدولت ہوتا ہے۔ اور پھر زبان میں بھی سمجھانے کے بڑے بڑے یہ دو طریقے ہیں شاعری اور دوسرے نثر۔ شاعری کے ذریعے ایک طرح بات ٹھوس پیکر میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔ نثر میں دلائل و براہین کے ذریعے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں شاعری معنی کو ٹھوس صورت میں دکھاتی ہے ہمیں اس کا احساس دلاتی ہے جبکہ نثر ہماری ذہنی قوا کو متاثر کرتی ہے۔

انیس نے چونکہ شاعری میں اپنی بات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے اس لئے انیس کے مراثی میں اس کے معانی نے طرح طرح کے روپ دھارے ہیں۔

انیس کی شاعرانہ بصیرت ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا

سکتا ہے۔ اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ انیس نے اپنی شاعری کا موضوع سانحہ کربلا کو قرار دیا ہے اور یہ موضوع انسانیت کا بہت بڑا موضوع ہے یعنی ایثار اور قربانی کا موضوع، جو فروغ انسانیت کے لئے بہت ضروری ہے اور پھر ایثار بھی ایک ایسی شخصیت کا جس کی ساخت و پرداخت میں سید المرسلین خاتم الانبیاء کا ہاتھ ہے۔ جس کو ختم الانبیاء کی بیٹی نے دودھ پلایا جس کا باپ شہر علم کا دروازہ علی ابن ابو طالب تھا۔

میں نے انیس پر اپنی پہلی کتاب "مطالعہ انیس کے نازک مراحل" میں بھی اسی بات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ میر انیس کے مراثی کی شاعری کو کسی خاص طبقے کی شاعری تصور کرنا میر انیس پر سب سے بڑا ظلم کرنا تو ہے ہی لیکن اس سے بھی بڑا ظلم انیس کے قاری پر ہے کہ انیس کی شاعری تو اسے تعصبات سے بلند کرنا چاہے لیکن سمجھا یہ جائے کہ انیس کی شاعری کسی خاص گروہ یا طبقے کے افراد کے لئے ہے، اس لئے اس کا قاری کسی خاص تعصب کا شکار ہو جائے گا اور اس کی نظر محدود ہو جائے گی۔ مراثیٔ انیس کو پڑھ کر آپ سانحہ کربلا کے بارے میں اتنا بہت کچھ جان نہیں جاتے جتنا کہ اس سانحہ کو آپ ماننے لگتے ہیں۔ آپ سانحۂ کربلا کی حقیقت کو جاننے کی نسبت اچھی طرح مان لیتے ہیں۔ تو سانحۂ کربلا آپ کے خون میں اتر کر آپ کے قلب و نگاہ کو ایسے ایسے اطراف حیات سے آگاہ کرتا ہے جس کا شعور آپ کو اس سے پہلے ہرگز ہرگز نہیں ہوتا۔ خدا کی پیدا کردہ یہ دنیا اور پھر اس میں اس کی سب سے بڑی تخلیق انسان یہ دو ایسی چیزیں ہیں اگر انہیں آرام و سکون سے رہنا میسر آجائے تو خدا کی خدائی کا تصور ایک عجیب سرمدی افق سے نمو پذیر ہوتا ہے۔ امام حسینؑ جس طرح ظلم کے خلاف کھڑے ہوئے اس طرح آج تک دنیا کا کوئی مظلوم کھڑا نہیں ہوا۔ ظلم کے خلاف کھڑا ہونے والا اور سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن وہ تنگ نظر تنگ دل کبھی نہیں ہو سکتا یوں

آپ جس طرح سانحہ کربلا سے وسعت قلب و نظر حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کی مثال ہمیں اور کہیں نظر نہیں آتی۔

میں یہ بات کسی تعصب کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ سانحۂ کربلا کے عقب میں جو عقیدہ کام کر رہا ہے وہ پوری انسانیت کی اصلاح و ترقی کا عقیدہ ہے۔ اس عقیدہ کی بنیاد میں کسی طرح کوئی تنگ نظری اور تنگ دلی کام نہیں کر رہی ہے۔ اس عقیدہ کی یہی وسعت ہے جس کے سامنے انیس کی شاعری کی تمام عظمتیں تمام ہنر مندیاں اور ہر طرح کے اعلیٰ درجے کے کرافٹ کی صفات ایک جگہ رہ جاتی ہیں۔ اور انیس کا عقیدہ ایک طرف۔ اسی لئے میرا یہ کہنا بھی ہے کہ انیس کو بہ حیثیت عظیم شاعر ماننا اس قدر اہم نہیں ہے جس قدر اہم انیس کے عقیدے کی معرفت اور آگاہی ہے۔ اصل میں انیس کے مراثی میں عقیدہ اور شاعری اس طرح آپس میں گھل مل گئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا نہ صرف آسان نہیں ہے بلکہ ناممکن سا ہو گیا ہے۔ آپ اگر انیس کو ایک بہت بڑا شاعر تسلیم کر رہے ہیں تو آپ کا یہ تسلیم کرنا اسی وقت کوئی موثر نقد و نظر کی صورت اختیار کر سکتا ہے اور کرتا ہے جب آپ کو اس شاعرانہ عظمت انیس کے ساتھ ساتھ انیس کے عقیدے کی عظمت اور وسعت کا بھی پوری طرح احساس ہے۔ پوری طرح احساس سے میری مراد یہی ہے کہ انیس کا عقیدہ آپ کے دل میں پوری طرح جگہ کر گیا ہے۔

میرے اس بیان سے آپ یہ خیال ہرگز نہ فرمائیں کہ انیس اپنے مراثی میں کسی قسم کی تبلیغ یا پروپیگنڈا کر رہا ہے۔ یہی تو انیس کی شاعری کی عظمت ہے کہ آپ اگر اس کا مطالعہ ٹھنڈے دل سے کرتے ہیں تو یہ عظمت آپ کو دل کی آواز کی طرح محسوس ہو گی۔ انیس نے سانحہ کربلا کی ایسی ایسی صداقتوں کو اپنے مراثی میں بیان کیا ہے اور پوری ہنر مندی کے ساتھ کیا ہے کہ ان صداقتوں کا بیان پوری

انسانیت کی فلاح و بہبود کا بیان بن گیا ہے۔ اور مراثیٔ انیس میں انسان اس طرح بلند ہوتا نظر آتا ہے جس کی بلندی کے سامنے فن کی عظمت دوسرے درجے پر آجاتی ہے۔ اس لئے اگر آپ محض مراثی انیس کی ادبی حیثیت کا کوئی محاکمہ کرتے ہیں۔ تو انیس کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کرتے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ انیس کی ادبی حیثیت سے تو کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک طرف انیس کی ادبی حیثیت کو تسلیم کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف انیس کو ایک مخصوص گروہ کا شاعر کہا جائے۔ وہی بات کہ اصل خرابی انیس کے ضمن میں یہی ہے کہ انیس کے موضوعات شاعری کی وسعت اور رفعت کا تاحال انصاف کے ساتھ اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔ اور اندازہ لگایا ہے کیسے جا سکتا ہے کہ موضوع کی رفعت اور وسعت کو تسلیم کئے بغیر شاعری کی رفعت اور وسعت آنکھوں کے سامنے ہونے کے باوجود آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انیس کی شاعرانہ عظمت انیس کے موضوعات سے بے خبری کے باعث نظر انداز ہو جاتی ہے۔ پھر وہی بات کہ انیس کا مطالعہ کرنے کے لئے وسعت قلب و نگاہ کی ضرورت ہے۔ جی ہاں ایسی وسعت قلب و نگاہ جو ایک بار مطالعہ انیس کا آغاز کرا سکے پھر اس کے بعد انیس کی شاعری خودبخود نئے نئے انداز سے وسعت قلب و نگاہ کا باعث بنتی چلی جاتی ہے۔

ویسے انیس کی شاعرانہ بصیرت ایسا موضوع ہے جس پر لکھنے والا لکھنا چاہے تو بہت کچھ لکھ سکتا ہے۔ اتنا بہت کچھ کہ بعد میں جس کا اندازہ لگانا مشکل ہو سکتا ہے۔ میر انیس اگر اپنے مراثی میں صبح کا منظر پیش کرتے ہیں تو اس کی وجہ محض آپ کو صبح کے منظر کا احساس دلانا نہیں بلکہ یہ بتایا مقصود ہے کہ اس منظر کا تعلق مظلومان کربلا کے ساتھ کس طرح کا ہے۔ اگر موسم کی گرمی کا ذکر ہے تو اس کے

معنی عام گرمی کے ذکر تک محدود نہیں۔ اس گرمی کو مظلومانِ کربلا کس حوصلہ اور عرفان کے ساتھ محسوس کر رہے تھے انیس اپنے قارئین کو یہ بتانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح انیس کی جذبات نگاری بھی عام اہل قلم کی سی جذبات نگاری نہیں ہے یہاں بھی مظلومانِ کربلا کی ہر طرح کے جذبات کا اظہار یعنی ان کے حوصلے مندی سے متعلق جذبات کا اظہار اور ان کے عام گوشت پوست کے انسانوں کے جذبات کا اظہار پھر جس طرح انیس کی جذبات نگاری اپنی نوعیت کی آپ ہے اسی طرح اس جذبات نگاری کو سمجھنے کے لئے قاری کو خاص توجہ دینی پڑتی ہے۔ انیس کے کردار بھی خاص کردار ہونے کے باوصف وہ عام کردار بھی ہیں۔انیس نے اپنے اعلیٰ کرداروں کو ایک لمحے کے لئے بھی عام کردار انسانی کی صفات سے جدا نہیں ہونے دیا۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے بھی قاری کی خاص توجہ درکار ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے اور خصوصاً انیس کے ضمن میں کہ جیسے جیسے ہم مراثی انیس کا مطالعہ کرتے ہیں ہماری یہ خاص توجہ آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے یعنی ہماری توجہ ایک لمحے کے لئے خاص ہو کر بہت سی خصوصیات کی حامل ہو جاتی ہے۔

ہماری توجہ مراثی انیس کے مطالعہ سے انسان کے ظلم وستم کا بھی ایک عجیب وغریب مشاہدہ کراتی ہے اور صرف مشاہدہ ہی نہیں کراتی اس ظلم وستم کے خلاف کھڑا ہونے کی قوت بھی بخشتی ہے۔لیکن اس قوت اور اس توانائی میں جو چیز کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اسے علم و دانش کی طاقت کا نہایت آسانی کے ساتھ نام دیا جا سکتا ہے۔ انیس انسانی جذبات سے کھیلتے نہیں انہیں مزید طاقتور بناتے ہیں۔ وہ جذبات کی تطہیر اور تہذیب کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔مگر وہی بات کہ اس تطہیر و تہذیب میں علم و دانش کی نگہداشت پوری طرح موجود ہوتی ہے۔ جذبات کو تعقل کے حوالے کر دینا کوئی آسان کام نہیں۔مگر انیس یہ مشکل کام اپنے

مراثی کے ذریعے بے حد آسانی کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں۔ یہاں آسانی سے میری مراد انیس کی قادرالکلامی ہے۔ انیس کو اپنے فن اپنے آرٹ پر اس قدر بھروسہ ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات کو کہاں تک پہنچانے کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں کہ وہ ابلاغ میں کسی قسم کے تکلف سے کام لیتے ہیں۔ ان کے ہاں بے تکلفی مہارت اختیار کر گئی ہے۔ اسی وجہ سے انیس اپنے عقیدے کے اظہار میں بھی کسی ایسی احتیاط سے کام نہیں لیتے جو ان کی بات کی وضاحت میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہو۔ عقیدہ انیس کے ہاں فن بن گیا ہے اور فن عقیدہ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے ایسی صورت میں فن کو عقیدہ سے الگ کر کے دیکھنا یا عقیدہ کو فن سے الگ کرنا مشکل ہی نہیں قریب قریب ناممکن ہے اسی لئے انیس کا ایک ذہین قاری فن کے صنائع بدائع کو عقیدہ کے صنائع بدائع کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انیس کا ہاں عقیدہ زبان بن گیا ہے اور زبان عقیدہ۔ آپ ایک دوسرے کو الگ کر کے ایک دوسرے پر صحیح معنی میں کسی تنقیدی نظریہ کی ساخت پرداخت نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عقیدہ اور فن کو ایک جان دو قالب بنا کر کسی قسم کی تنقید کرنا آسان کام نہیں۔ لیکن یہ کوئی اتنا مشکل کام بھی نہیں ہے کہ جس کے لئے آپ کو الگ سے کوئی تگ و دو یا سرگرمی دکھانی پڑے بس آپ کے ذرا فیصلہ کرنے کی دیر ہے۔ اور آپ جانتے ہیں اس طرح کے فیصلے کرنے میں خواہ مخواہ کے تعصبات دیوار بنا کرتے ہیں۔ تعصبات کی دیواروں کو تہس نہس کرنا پھر اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے لیکن یہ مسئلہ بھی آپ کے فیصلے ہی کے ذریعے حل ہوتا ہے۔ ایسے فیصلے کے ذریعے جس میں کچھ خرچ نہیں آتا بس اپنی انا کو بیدار کرنا ہوتا ہے۔ یعنی اندھیرے سے روشنی میں لانے والی بات' گھٹن کو دور کرنے والی بات۔ کھلی فضا میں سانس لینے والی بات۔ بعض اوقات ہی نہیں اکثر

اوقات ذرا توجہ دینے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ گھٹن اور کھلی فضا میں ایک قدم کا بھی فاصلہ نہیں ہوتا۔

مراثیٔ انیس آپ کو اندھیرے سے روشنی میں بھی لاتے ہیں۔ اس روشنی کا کمال یہ ہے کہ یہ آپ کی نظروں کو خیرہ کبھی نہیں کرتی۔ یقیناً مراثیٔ انیس میں ایسی روشن فضاؤں کی بھی کوئی کمی نہیں جن کو ہم عام صورت حالات میں خیرہ کرنے والی روشنی سے بھرپور فضائیں کہہ سکتے ہیں لیکن انیس کی خاص روشن فضائیں آپ کی نگاہوں کو اتنی تربیت دے چکی ہوتی ہیں۔ کہ پھر وہ اس طرح کی عام روشن فضاؤں سے خیرہ نہیں ہوتی۔ میں نے اپنی اس کتاب میں مراثیٔ انیس سے خاص روشن فضاؤں کی لمبی چوڑی مثالیں پیش نہیں کیں۔ اور وہ محض اس لئے کہ یہ کام میں نے آپ کے مطالعہ کے لئے چھوڑا ہے۔ آپ جہاں سے بھی اس کارِ خیر کا آغاز کریں گے آپ کی آنکھیں خودبخود روشن ہوتی چلی جائیں گی۔ میں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں شاید ہی کہیں ایک دو بند پیش کئے ہوں ورنہ عموماً ایک ایک شعر یا ایک ایک بیت پر اکتفا کیا ہے کہیں کہیں تو پورے مرثیے میں سے میں نے اس کا صرف ایک مصرع ہی پیش کیا ہے۔ اس سے قبل بھی میں نے کہیں کہا ہے کہ اگر آپ میر انیس کے مراثی سے مثالیں پیش کرکے بات کرتے ہیں۔ تو پھر اس بات کا اختتام جلدی سے ہوتا نظر نہیں آتا۔ اور میں اس ضمن میں اسے کوئی اچھی بات نہیں سمجھتا کہ اپنے قاری کی ذہانت کی بجائے خواہ مخواہ اپنی ذہانت کا ڈھول بجاؤں۔ ہاں میں یہاں آخر میں یہ بات ضرور کہوں گا۔ کہ میری اس کتاب کی تحریریں آئندہ کے لئے انیس پر بہت بڑے کام کا آغاز بن سکتی ہیں اور ہوسکتا ہے میرا یہ دعویٰ بھی کوئی خاص وزن نہ رکھتا ہو۔ خالی پھیکا دعویٰ کرنا بھی تو کوئی خاص دانشمندی کی دلیل نہیں۔

مشکور حسین یاد

۸۔ ظفر کالونی سمن آباد لاہور

میرانیس کا تصور فصاحت و بلاغت

ظاہر ہے میں عام تصورِ فصاحت و بلاغت کے بارے میں بات نہیں کروں گا لیکن آپ جانتے ہیں عام تصور کے بارے میں بات کیے بغیر کسی خاص تصور کا پتا بھی تو نہیں چلتا۔ اس لئے میں یہاں عام تصور کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں اتنی بات ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں علماء بیان کی طرح بات ہرگز نہیں کروں گا۔ اس وقت میرے سامنے میرانیس کے ایک مشہور مرثیے کے پہلے دو مصرعے ہیں جن پر مجھے بات کرنی ہے۔ جی ہاں اس مرثیے کی شہرت پر بھی غور فرمائیے اور میری گذارشات پر بھی۔

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری
ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری

آپ جانتے ہوں گے کہ کچھ عرصہ میرانیس کے منجھلے صاحب زادے میر عسکری رئیس اس مرثیے کو اپنے نام سے پڑھتے رہے بعد میں یہ مرثیہ میر انیس کے نام ہی سے پڑھا جانے لگا۔ طبا طبائی نے اس مرثیے کو مراثی انیس ہی میں شامل کر رکھا ہے۔ بہر حال میرانیس نے ان دو مصرعوں کے مطابق پہلے فصاحت کو

خوان تکلم کا نمک کہا ہے۔ اور پھر بلاغت کی تعریف یہ کی ہے کہ ان کا کلام سن سن کر لوگوں کے ناطقے بند ہیں۔ یعنی جو کچھ میر انیس نے فرما دیا اس سے آگے کچھ کہنے کی ہمت کسی میں نہیں ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بلاغت کی تعریف ہی یہ ہے کہ کسی بات کو کم سے کم الفاظ میں اس طرح کہا جائے کہ پھر اس بات کی رسائی میں کوئی کمی محسوس نہ ہو۔ یوں محسوس ہو جیسے بات مکمل ہو گئی۔

لیکن بلاغت سے پہلے جو میر انیس نے فصاحت کو تکلم یا کلام کے دستر خوان کا نمک کہا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ میر انیس نے انسان کے کلام کرنے یا بات کرنے کو طرح طرح کے کھانوں سے تشبیہ دی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو انسان کی گفتگو کیا ہوئی ذائقوں سے بھرپور ایک دستر خوان ہوا۔ جس سے انسان مستفید ہوتا چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے آدمی کھانا اس لئے کھاتا ہے کہ اس کے جسم و جان میں طاقت آئے اور طاقت کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ ہم زندگی میں آگے بڑھیں بلکہ آگے بڑھتے چلے جائیں۔ گویا آگے بڑھنے کا تسلسل آدمی کو بولنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر آدمی زبان کو استعمال نہ کرے تو وہ زندگی کی راہوں پر آگے قدم نہیں بڑھا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک آدمی نے بولنا نہیں سیکھا تھا یا اچھی طرح بولنا نہیں سیکھا تھا زندگی کی راہوں پر اس کے قدم آگے نہیں بڑھ رہے تھے۔

علمائے ادب کے حوالے سے شبلی نعمانی نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے۔ لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تنافر نہ ہو (یعنی لفظ کو بولنے میں آسانی ہو) الفاظ نامانوس نہ ہوں قواعد صرفی کے خلاف نہ ہوں۔" گویا شبلی نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ الفاظ آسانی اور روانی سے ادا ہو سکیں۔ سادہ اور مانوس ہوں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو فصاحت کی یہ تعریف ایسی ہے جس سے کسی زبان

کا عام آدمی اچھی طرح روز مرہ تجربے سے گزرتا ہے۔ فصاحت عام آدمی کا شیوۂ گفتار نہ ہو تو کوئی بات بھی ادھر سے ادھر نہ پہنچ سکے۔ یوں فصاحت' بلاغت کی اولین شرط ٹھہرتی ہے۔ کیونکہ بلاغت کے تو معنی ہی پہنچنا اور پہنچانا سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ عام زبان میں ہم بلاغت کو اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ جو بات پہنچ گئی وہ بلاغت کے درجے پر فائز ہو گئی۔

لیکن علم بیان اور بدیع کا کام صرف بات کے پہنچنے تک نہیں ہے۔ اتنی صلاحیت اور طاقت تو عام زبان میں موجود ہوتی ہے۔ کہ اس کے ذریعے عام آدمی بھی اپنی بات کو دوسرے تک پہنچا سکتا ہے اور پہنچادیتا ہے۔ اصل میں فصاحت اور بلاغت کا تعلق بات کے پہنچنے تک نہیں ہے۔ فصاحت اور بلاغت کا کام تو بات کے پہنچنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔یعنی جو بات کسی تک پہنچی ہے۔ اس پر عمل پیرا ہو جائے زبان کا اصل مقصد آدمی کو حرکت میں لانا ہے اور کسی ترتیب اور سلیقے کے ساتھ حرکت میں لانا ہے اور آپ یہ تو جانتے ہی ہیں کہ آدمی کے حرکت میں آنے کا اصل مطلب آگے بڑھنا اور ترقی کرنا ہے۔

میر انیس نے جو اپنی فصاحت کی تعریف کی ہے کہ وہ طرح طرح کے ذائقوں سے لبریز ہے یعنی آدمی میر انیس کی بات کو سن کر بڑے مزے کے ساتھ حرکت میں آتا ہے۔ اور فصاحت کو بات کرنے کے دستر خوان کا نمک کہہ کر میر انیس نے اپنے کلام کو عام قسم کے ذائقوں سے لبریز نہیں کہا بلکہ جس طرح نمک سے کسی کھانے کا ذائقہ بنتا ہے اور نمک اس کھانے کو کھانے کے قابل بناتا ہے اسی قابلیت میں میر انیس کے کلام کی ساری لذت پوشیدہ ہے۔ کھانا تو نمک کے بغیر بھی تیار ہو جاتا ہے۔ اور ویسے بھی نمک کی شرکت بہت دیر کے بعد ہوئی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے آدمی کے کھانوں کی تاریخ میں نمک کا اضافہ۔

ایک تازہ اضافہ ہے۔ مگر ہم اسے خوبصورت اور لذیذ اضافہ کسی تکلف کے بغیر کہہ سکتے ہیں۔ اور پھر مزید لطف کی بات یہ ہے کہ جدید لسانی تحقیق کے مطابق ہر شخص کی فصاحت اپنا ایک الگ ذائقہ رکھتی ہے۔ جو کہ اس کا نمک ہر روز اپنے ایک ذائقہ کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور ہم ہر روز زبان کے نئے سے نئے ذائقوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زبان کے ذریعے ہم تازگی کے نئے سے نئے آفاق سے ہمکنار ہوتے رہتے ہیں۔ زندگی کی تازگی کا احساس جس قدر ہمیں زبان کی وساطت سے حاصل ہوتا ہے اور کسی دوسرے وساطت سے حاصل نہیں ہوتا۔ جس طرح ہم ہر لحہ ایک نئے لباس میں دوسرے سے ملنا پسند کرتے ہیں اور تازگی کو ہر لحہ اپنے سے قریب رکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارے اس احساس تازگی کو جو چیز سب سے زیادہ تسکین پہنچاتی ہے۔ وہ زبان ہے۔ بغور دیکھا جائے تو انسان کی زبان سے جو لفظ جو کلمہ نکلتا ہے ایک تازہ غنچے یا پھول کی طرح ہوتا ہے زبان کی مزید سخاوت ہمارے حال پر یہ ہے کہ زبان کی تازگی کا احساس اتنا شعوری نہیں ہوتا جتنا کہ سانس لینے کی طرح غیر شعوری ہوتا ہے۔

اس گفتگو کی روشنی میں ہم یہ بات آسانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس کی فصاحت ایک لذیذ' خوبصورت اور زندگی کے قدم آگے بڑھانے والی ایسی تازگی ہے جو سانحہ کربلا کے واقعات کو اس طرح ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جیسے وہ اب ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع میں آرہے ہیں۔ واقعات کربلا کو جیتے جاگتے انداز میں پیش کرنے کی صلاحیت ہی میر انیس کی فصاحت ہے اور جب یہ واقعات لوگوں کے دلوں پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں تو اسی بات کو میر انیس نے اس طرح کہا ہے۔ ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری۔ کوئی بات اگر پوری طرح پہنچ جائے تو پھر کسی میں اس سے متعلق کوئی ایک لفظ بھی بولنے کی ہمت کہاں

باقی رہتی ہے۔

پھر وہی بات کہ میں اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مراثی انیس میں سے کونسا مرثیہ پیش کروں آپ کوئی سا مرثیہ اٹھا کر دیکھ لیجئے میرے دعوے کی صداقت آپ کو معلوم ہو جائے گی۔ میر انیس اپنی فصاحت کے ذریعے ماضی کو حال میں اس خوبی' اس مہارت' اس فن کاری اور کرافٹ کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ماضی کی کہنگی حال کی تازہ کاری میں بدل جاتی ہے۔ تو یہ میر انیس کی فصاحت ہی کا سارا کرشمہ ہے لیکن آپ اس فصاحت کو محسوس کرنے کے موڈ میں نہیں تو پھر مجھے کہنے کی اجازت دیجئے کہ میر انیس کی فصاحت بھی عام انداز کی فصاحت نہیں ہے یعنی محض سادہ الفاظ' محض مانوس الفاظ کا مجموعہ...... ان الفاظ میں میر انیس کے فن کے ساتھ ساتھ جو ان کے عقیدے نے ایک روشنی پیدا کی ہے اس روشنی کا عرفان بھی دیکھنے والی آنکھوں ہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میر انیس کی فصاحت میں جو ایک سلونا پن ایک ملاحت ایک دل میں گھر کر جانے والا روپ پیدا ہوا ہے یہ سب ان کے عقیدے کے نور کا ایک پر تو ہے۔ اور یہاں عقیدے سے مراد واقعات کربلا کو خلوص کے ساتھ بیان کرنے کا عزم ہے۔ دیکھ لیجئے زیادہ نہیں میر انیس کے ایک مرثیے کی یہاں بھی صرف ایک بیت پیش کر رہا ہوں۔ صورت حال یہ ہے کہ حضرت عباس کو دشمنوں کا لشکر میں ایک نے کہا کہ آپ فرات کے کنارے اپنے خیمے نہ لگائیے یا اٹھا لیجئے۔ اس پہ حضرت عباس کو غصہ آ گیا ہے۔ اس غصے میں حضرت عباس فرماتے ہیں۔

حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیت الٹ دیں زمین کو

اس بیت کی فصاحت و بلاغت یہ ہے کہ ایک تو حضرت عباس کے بیان

میں ہمیں کہیں مبالغہ محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ حالانکہ بظاہر مبالغہ موجود ہے لیکن یہ مبالغہ حقیقت میں ڈھلتا ہوا محسوس اس لئے ہوتا ہے کہ اس بیت کا پہلا مصرعہ بہت ہی حقیقت پر مبنی ہے۔ یعنی حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو۔ ظاہر ہے حملہ تو اسی طرح کیا جاتا ہے۔ آستین چڑھائی جاتی ہے گویا اس میں مبالغہ تو کہیں دور دور بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ بلکہ لڑنے والے کے مضبوط عزم کا ضرور پتہ چل رہا ہے اور یہ عزم مضبوط اس قدر ہے اور اس خوبی سے اس کی مضبوطی کا احساس ہوتا ہے کہ پھر اگلے مصرعے میں جو مبالغہ آیا ہے وہ مبالغہ نظر نہیں آتا' عین حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ دیکھیے نا جو شخص اور شخص بھی کون حضرت عباسؑ حملہ کے لئے اگر آستین الٹے گا تو آستین کے الٹنے کے ساتھ کیسے نہ آسمان سمیت زمین کو الٹ دے گا۔ آستین الٹنے کا عمل آسمان سمیت زمین الٹنے کے عمل سے کچھ بھی تو دور نظر نہیں آتا۔ بلا کی تازگی کا احساس اس بیت میں ہر بار ہوتا ہے۔ جیسے ہی یہ بیت پڑھی جاتی ہے۔

حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیت الٹ دیں زمین کو

اور پھر مزید لطف کی بات یہ ہے کہ جس طرح آستین چڑھانا کوئی مشکل کام نہیں اسی طرح آستین چڑھانے کے زور میں آسمان سمیت زمین کے الٹ دینے میں بھی کوئی خاص مشکل نظر نہیں آتی۔ اس کے علاوہ اس بیت میں ''اگر'' کے لفظ نے جو ایک شرط کے باعث سوچنے کی فرصت فراہم کی ہے اس نے اس بیت میں عمل کے بار بار وقوع میں آنے کے عجیب طرح کے امکانات پیدا کر دیئے ہیں۔ جو مستقل طور پر جرأت بھی پیدا کر رہے ہیں۔ اور مبالغے کی تازہ کاری کو معمول میں بدلنے کے عمل میں بھی مددگار ثابت ہو رہے ہیں۔ یقیناً اس بیت میں فصاحت کے سلونے پن اور ذائقے کی حلاوت کو آپ ضرور محسوس کر رہے ہونگے۔

کیونکہ میر صاحب خود فرما رہے ہیں۔

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری

اب یہ پھر الگ بات ہے کہ آدمی نمک چکھ کر اور وہ بھی اہل بیت کے گھر کا نمک چکھ کر کس طرح اپنی آستین الٹتا ہے جو اس کے ساتھ ہی آسمان سمیت زمین بھی الٹتی نظر آتی ہے۔

میں نے سوچا آخر میں کیوں نہ آپ کو میرانیس کی فصاحت و بلاغت کے مختلف رنگوں اور ذائقوں سے آشنا کیا جائے چنانچہ میں نے کسی تکلف کے بغیر میر انیس کے مراثی کی ایک جلد کھولی اوراس میں سے جو مرثیہ میرے سامنے آیا اس کے چند بند پیش کر رہا ہوں۔ دیکھئے مرثیے کا آغاز فصاحت اور بلاغت کے کس رنگ و ذائقہ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

جب رن میں سر بلند علی کا علم ہوا۔ اس مصرع کے تین لفظ "علی کا علم" اس آہنگ کے ساتھ آئے ہیں کہ واقعی ہمیں علی کا عَلَم سر بلند ہوتے ہوئے جیسے دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں دوسرے مصرع کی صداقت منظر کا احساس بھی ہوتا ہے۔ دوسرا مصرع ہے۔

فوجِ خدا پہ سایۂ ابرِ کرم ہوا

ظاہر ہے کہ علی کے علَم کے بلند ہونے سے اس کا سایۂ ابرِ کرم کے سائے کی طرح کا تو محسوس ہونا تھا۔ اس کے بعد تیسرے مصرع میں حسنِ تعلیل نے کیا خوب رنگ و ذائقہ پیدا کیا ہے۔

چرخِ زبر جدی پے تسلیم خم ہوا

گویا علم کی ایسی شان و شوکت تھی کہ جس کے رعب میں آکر آسمان بھی سلامی کے لئے جھک گیا تھا۔ اور ان سب کے نتیجے میں صنعت اعداد کا لطف بھی

دبدنی و چشیدنی ہے حالانکہ صاف پتا چل رہا ہے کہ شاعر یہ صنعت جان بوجھ کر لایا ہے لیکن پھر بھی چونکہ یہ صنعت نہایت بے تکلفی سے استعمال ہوئی ہے ۔لہٰذا فصاحت اپنا رنگ و ذائقہ دکھا رہی ہے اور ہمیں محظوظ بھی کر رہی ہے۔

پنجے پہ سات بار تصدق حَشَم ہوا

حَشَم کے معنی تو آپ جانتے ہی ہیں وہ نوکر چاکر جو بادشاہ کے ساتھ خدمت کرنے اور جنگ وغیرہ کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ یوں سمجھئے حَشَم کے لفظ نے میدان کربلا میں کیا دوست اور کیا دشمن جتنی بھی فوج تھی سب کے سب کو علم پر نچھاور کر دیا۔ پانچویں اور چھٹے مصرع کی بیت اس طرح ہے۔

دیکھا نہ تھا علم جو کبھی اس نمود کا
دونوں طرف کی فوج میں غل تھا درود کا

چھٹے مصرع میں جو شان و شوکت کے ساتھ طنز کا پہلو ہے میں اسے بھی واضح کرنا چاہتا ہوں۔ دونوں طرف کی فوج میں جو درود کا غل تھا اس سے پتا چل رہا ہے کہ ماشاء اللہ دونوں طرف مسلمان تھے اور ایک دوسرے کے سامنے صف آراء تھے اور ایک دوسرے کے سامنے بھی کیا مسلمان اپنے ہی نبی کے نواسے کے سامنے صف آرا تھے۔ اور اس کے خون کے پیاسے ہو کر صف آرا تھے۔ پرچم یعنی عَلَم کی شان میں سات بند کہے گئے ہیں۔ جی تو چاہتا ہے کہ ہر بند کی اس طرح تفہیم کروں لیکن خوف طوالت سے ایک دو بند مزید پیش کرتا ہوں۔

قربان احتشامِ عَلَم دارِ نامورؑ   رُخ پر جلالت شہ مرداں تھی سر بسر
چہرہ تو آفتاب سا اور شیر سی نظر   قبضے میں تیغ، بر میں زرہ، دوش پر سپر

چھایا تھا رعب، لشکر ابن زیاد پر
غل تھا چڑھے ہیں شیر الٰہی جہاد پر

اس بند میں فصاحت' بلاغت کو سنبھالے ہوئے ہے تو اسی طرح بلاغت فصاحت کو۔ پہلے مصرع میں اگر تین اضافتیں آئی ہیں۔ جن کی وجہ سے معنی میں بلاغت پیدا ہو رہی تو وہ الفاظ جن پر اضافتیں آئی ہیں وہ غیر مانوس نہیں اس لئے فصاحت اپنی جگہ قائم ہے۔ دوسرے مصرع میں دو اضافتوں نے بلاغت کو سمیٹا ہے تو سر بسر کے لفظ نے پھر فصاحت کا پلڑا بھاری کر دیا۔ تیسرے مصرع میں کوئی اضافت نہیں لیکن تشبیہ کے بہت ہی عام سے حروفِ شبہ سا سی نے بلاغت کا ہنر دکھایا ہے تو آفتاب اور شیر کے الفاظ نے فصاحت کو معنی سے قریب کر دیا۔ اور چوتھے مصرع کے آہنگ نے تو گویا تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ اور اگر ان چار مصرعوں میں کوئی کمی باقی رہ گئی تھی تو اس بند کی بیت نے ساری بات کو واضح کر دیا ہے کہ ابن زیاد کے لشکر پر اس قدر رعب چھایا تھا کہ وہ حضرت عباس کو حضرت علی سمجھ رہا تھا۔

وہ اوج وہ جلال وہ اقبال وہ حشم ۔۔۔ وہ نور وہ شکوہ وہ توقیر وہ کرم
پنجے کی وہ چمک وہ سرافرازیٔ علَم ۔۔۔ گرتی تھی برق' فوجِ مخالف پہ دم بدم
کیا رفعت نشانِ سعادت نشان تھی
سائے میں جس نشان کے طوبیٰ کی شان تھی

اس سے اگلا بند ہے۔

پنجہ اٹھا کے ہاتھ یہ کہتا تھا بار بار ۔۔۔ عالم میں پنجتن کی بزرگی ہے آشکار
یہ شش جہت انہیں کے قدم سے ہے برقرار ۔۔۔ کیوں ہفت دست ہوتے ہو اے قومِ نابکار
آٹھوں بہشت ملتے ہیں مولا کے نام سے۔
بیعت کرو حسین علیہ السلام سے

پہلے اور دوسرے مصرع کی فصاحت و بلاغت' صنائع و بدائع سے لبریز

اپنی جگہ لیکن اس میں انسانی نفسیات کے ایک نمایاں معنوی پہلو کی طرف جواشارہ کیا گیا ہے وہ بھی قابل غور ہے جو علم نکالنے کے جواز کو ظاہر کر رہا ہے یعنی علم کا پنجہ پنجتن کی عظمت کو ظاہر کر رہا ہے مطلب یہ ہے کہ پنجتن کی بزرگی پر ہم یوں تو اپنی مصروف زندگی میں غور نہیں کرتے علم کے پنجے کو دیکھ کر ہی ہماری توجہ کو اس طرف مبذول ہوجانا چاہئے یا وہ توجہ علم کو دیکھ کر خود بخود اس حقیقت کی طرف مبذول ہوتی ہے۔ تیسرے مصرع میں صنعت اعداد پھر نہایت بے تکلفی کے ساتھ ایک ٹھوس حقیقت کا اظہار کر رہی ہے اور وہ ٹھوس حقیقت یہ ہے کہ یہ عالم طبیعات فزکس کا عالم جو ہے دراصل وہ ان پانچ پنجتن مقدس ہستیوں کی وجہ سے قائم و دائم ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اب تک بے شمار پیغمبر اولیاء اللہ پیدا ہوئے لیکن کسی نے بھی اس طرح اس فزیکل ورلڈ کے وجود کی اہمیت کو واضح نہیں کیا جس طرح کہ پنجتن نے کیا ہے۔ پنجتن جن میں اصل راہنما ہستی ہمارے نبیؐ آخر الزماں کی ہے اپنے قول وفعل سے یہ بتاتے ہیں کہ یہ دنیا بے مقصد پیدا نہیں ہوئی۔ اس کا ایک مقصد ہے جس کی تشریح ہر زمانے میں اس زمانے کی عقل و دانش کے مطابق ہوتی رہی ہے۔ چوتھے مصرعے میں 'مُفت دوست' کی ترکیب سے پتا چلتا ہے کہ میر انیس نے جان بوجھ کر صنعت اعداد کا استعمال کیا ہے لیکن معنوی اعتبار سے یہ مصرع بھی مسلمانوں پر ایک بھرپور طنز ہے کہ اے نکمے لوگو جان بوجھ کر انجان اور دور کے دوست بن رہے ہو جبکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تم نواسۂ رسول اور ان کے رفقا سے جنگ کر کے انصاف نہیں کر رہے ہو۔

اب تک میر انیس علَم حضرت عباس علمدار کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ مندرجہ ذیل میں آپ میر انیس کی فصاحت و بلاغت کا ایک دوسرا رنگ و ذائقہ ملاحظہ فرمائیں گے۔ رفقائے حسینی کے بارے میں میر انیس فرماتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کربلا میں ان کی آمد ہی گویا فوج حسینی کی آمد تھی۔ لہٰذا اس فوج کی تعریف ہو رہی ہے۔

آگے کبھی نہ دیکھی تھی اس حسن کی سپاہ دنیا بھی خوبیوں کا مرقع ہے واہ واہ
دیکھیں کسے کسے کہ ہے ایک ایک رشک ماہ جاتی ہے جس کے رخ پہ تو پھرتی نہیں نگاہ
دیکھو انہیں دموں سے ہے رونق زمین کو
چن کر حسین لائے ہیں کس کس حسین کو

اس بند کے پہلے دو مصرعوں سے ایک عجیب حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے۔ عموماً انسان اس دنیا کو برا کہتا ہے اور اس میں اسے بدی ہی بدی نظر آتی ہے کسی حد تک یا بڑی حد تک یہ بات درست بھی ہے لیکن انسان کی اس نفسیات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جہاں اسے کوئی یا چند لوگ بھی اچھے نظر آتے ہیں اس کا دنیا کے بارے میں منفی نظریہ فوراً بدل جاتا ہے۔ جیسے ہی امام حسین کے رفقاء کی فوج سامنے آئی گویا ایک حسن کی فوج سامنے آگئی۔ یقیناً یہ حُسن کی فوج ہے تو حسن کے لئے ہی لڑے گی یعنی اس فوج کے ہاتھوں زندگی کے حُسن و جمال کو فروغ حاصل ہو گا۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ حسن کی فوج اپنے عمل سے کچھ کرکے دکھائے اس کے وجود ہی سے زندگی پر ایک عجیب طرح کا اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ گویا انسان خوبیوں کی داد دینے کے لئے بھی ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔ بشرطیکہ کوئی چیز نظر تو آئے۔ لہٰذا کیا خوب کہا ہے۔ دنیا بھی خوبیوں کا مرقع ہے۔ واہ واہ۔ ویسے بغور دیکھا جائے تو میر انیس اپنی شاعرانہ بصیرت کا پورا پورا ثبوت اسی مصرع میں پہنچا رہے ہیں۔ چونکہ ابھی عمل شروع نہیں ہوا اس لئے یہ لوگ خوبیوں کا مرقع نظر آرہے ہیں۔ ''مرقع'' کا لفظ عمل سے پہلے کی کیفیت کو ظاہر کر رہا ہے اور یہی بات میر انیس کی فصاحت و بلاغت کے رنگ و ذائقہ دونوں صورتوں کو واضح بھی کر رہی

ہے اور وہی بات میر انیس کی شاعرانہ بصیرت کا بھی منہ بولتا ثبوت ہے۔ تیسرے مصرعے کے الفاظ دیکھیں کیسے کیسے ''ظاہر کرتے ہیں کہ انسان اچھائی کو جی بھر کر دیکھنے کا متمنی رہتا ہے۔اور جب مجسم ہو کر بہت سی اچھائیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ تو اس کے ہاتھ پاؤں خوشی کے مارے پھول جاتے ہیں۔ اس بند کا پانچواں مصرع تو چوتھے مصرع کے مضمون ہی کو آگے بڑھاتا ہے۔ لیکن چھٹے مصرع میں میر انیس نے پھر اپنی فصاحت و بلاغت کا کمال دکھایا ہے اور پوری کربلا کی تاریخ کس کرب اور کس اختصار سے بیان کر دی ہے۔ ''چن کر حسین لائے ہیں کس کس حسین کو'' اور یہاں صرف ایک لفظ ''ہیں'' اس درد و کرب زمانہ کو حاضر میں لا کر اور بھی تیز کر رہا ہے۔ کہ یہ سب حسین عصر کے وقت تک خون میں نہا جائیں گے۔ انسان خود ہی کس قدر سفاک بھی واقع ہوا ہے کہ اچھے لوگوں کو زندہ نہیں رہنے دیتا۔

ویسے تو اس فوج حسن و جمال کے ایک ایک فرد کا نقشہ میر انیس نے اپنے اس مرثیے میں کھینچا ہے لیکن میں ان سب کو چھوڑتے ہوئے اس فوج حسن و جمال کے سپہ سالار کے بارے میں صرف ایک بند پیش کر کے اپنے مضمون کو ختم کرنا چاہوں گا۔ میری گذارشات سے قبل وہ بند سماعت فرمالیجئے۔

اس مہر کو تو دیکھو یہ ذرے ہیں جس کے سب سرتاج آسمان و زمین نورِ عرش رب
ابر کرم خدیو عجم خسر و عرب عالی ہمم امام امم شاہ تشنہ لب
جنباں زبانِ خشک ہے ذکرِ الٰہ میں
گویا کھڑے ہیں ختم رُسُل رزم گاہ میں

امام حسینؑ کی فوج حسن و جمال کے بعد میر انیس امام حسین کا تذکرہ فرما رہے ہیں۔ لیکن دیکھنے کی بات ہے اور یہ بات میر انیس کے تمام مراثی کی خصوصیت ہے کہ میر انیس جس طرح ایک لمحے کے لئے مقتل کربلا سے نہیں نکلتے۔

اسی طرح وہ مادی دنیا اور اس کے تقاضوں کو بھی فراموش نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے میر انیس کے مراثی میں دین و دنیا دونوں کے احوال ملتے ہیں۔ اور اپنے ہی انداز میں گندھے ہوئے۔ اب اسی مندرجہ بالا بند کو لے لیجئے۔ پہلے مصرع میں خالصتہ تشبیہ و استعارہ میں بات ہو رہی ہے اور مہر اور ذروں کا ذکر ہونے کے باوجود وہ مہر اور ذرے مادی مخلوق نظر نہیں آ رہے ۔ اور وہ سورج وہ مہرآسمان و زمین کا سرتاج بھی ہے اور عرش رب کا نور بھی۔ وہی بات کہ بیک وقت تشبیہ اور تنزیہہ کے دونوں عالموں کا ذکر ہے۔ پھر ابر کرم اورخدیو عجم اور خسرو عرب تو ہے ہی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ عالی ہمم ہے یعنی اس کے حوصلے اس کی ہمتیں بہت بلند ہیں پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ امام امم بھی ہے یعنی امتوں کا راہنما۔ مگر کمال بلاغت دیکھئے کہ بات پھر یہاں ختم نہیں ہوجاتی سب سے آخری اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ شاہ تشنہ لب ہے۔ اپنی تمام تر بادشاہت کے باوجود وہ پیاسا ہے اس طرح امام حسینؑ کا خدیو عجم ہونا' خسرو عرب ہونا' عالی ہمم ہونا' امام امم ہونا حتی کہ ابر کرم ہونا بھی ایک طرف رہ جاتا ہے۔ اس کا پیاسا ہونا اس کو انسانیت کی سب سے بڑی بلندی پر لے جاتا ہے۔ اور پھر اس بند کے پانچویں اور چھٹے مصرعوں یعنی بیت میں پیاس کی اس بلندی کی میر انیس نے کس موقلم فصاحت و بلاغت سے تصویر کھینچی ہے کہ چشم بینا دیکھتی کی دیکھتی رہ جاتی ہے۔ زبان خشک ذکر الہ میں ہل رہی ہے مصروف حمد و ثنا ہے اور اس کی وجہ سے یوں لگتا ہے جیسے ختم رُسُل رزم گاہ میں کھڑے ہیں۔ اس تصویر کشی کا کوئی جواب ہے۔فصاحت و بلاغت کا یہ وہ رنگ اور وہ ذائقہ ہے جو بڑے بڑے شعراء کو کیا نصیب ہوگا۔ جو میر انیس کو ان کے اپنے آفاقی عقیدے کے باعث نصیب ہوا اور جس نے ان کی شاعری کو بھی ایک اپنے ہی انداز کی عظمت بخشی ہے۔ اور پھر اس عظمت میں ان کی شاعرانہ بصیرت کس طرح نمودار ہے۔

تنقید میں محبت کا عمل دخل

(تنقید میں ایک انوکھا زاویہ' شعرِ انیس کے حوالے سے)

محبت کا رشتہ نہایت ہے نازک
مجھے کس لئے قدر داں کھینچتے ہیں

آپ جانتے ہیں یہ شعر میر انیس کے ایک مشہور سلام کا ہے لیکن کلام انیس پر نقد و نظر کے ضمن میں کم از کم مجھے اس شعر میں بہت کچھ نظر آیا جبھی تو میں نے اس پر پوری ایک کتاب لکھ دی ہے جس کا عنوان ہے "مطالعہ انیس کے نازک مراحل" یعنی میری دانست کے مطابق انیس نے اپنے کلام بالخصوص' مرثیہ پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی خاطر اس شعر میں نقادوں کے لئے تنقیدی توجہ کا ایک جداگانہ لائحہ عمل پیش کیا ہے۔ کلام انیس کو کس طرح پڑھنا چاہئے۔ اس پر کس طرح تنقیدی نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ کلام انیس کی آپ کس طرح قدر و منزلت کر سکتے ہیں۔ اس طرح کے جملہ سوالات کے جوابات دینے کی میر انیس نے اپنے اس زیر بحث شعر میں کوشش کی ہے لیکن اس شعر میں صرف کلام انیس کے لئے ہی نقد و نظر کے لئے نئے زاویے موجود ہیں ۔ وسیع معنی میں بھی تنقید کے حوالے سے یہ شعر اپنے

جداگانہ معانی کا حامل ہے۔

اس شعر کی پہلی قرأت سے جو معنی کا ابلاغ ہوتا ہے وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک تو میر انیس عام انداز میں اپنے کلام پر کسی قسم کی تنقید کے طالب نہیں ہیں۔وہ خالی پھیکی جذباتی قدر دانی کو واضح طور پر بیکاری چیز سمجھتے ہیں۔ اسی لئے تو فرما رہے ہیں ۔مجھے کس لئے قدر داں کھینچتے ہیں۔ کھینچنے کے عمل سے صاف پتا چل رہا ہے کہ وہ قدر دانوں کی محفل میں عام انداز میں جانا نہیں چاہتے۔مگر قدر دان ہیں کہ انہیں لے جانا چاہتے ہیں۔ کھینچنے کے عمل سے جہاں بظاہر میر انیس کا اجتناب نمایاں ہے وہاں میر انیس کے چاہنے والوں کی محبت کا بھی پتہ چل رہا ہے کہ وہ میر انیس کے قدر دان ہونے کا ثبوت دینے کے خواہاں ہیں۔لیکن میر انیس نے اپنے اس شعر میں نقد ونظر کا ایک انوکھا معیار رکھا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ جس شاعر پر تنقیدی نگاہ سے کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی شرط اول یہ ہے کہ آپ کو اس شاعر کے ساتھ قلبی لگاؤ ہونا چاہئے۔ اگر آپ کا شاعر آپ کا محبوب نہیں ہے تو پھر آپ اس پر صحیح معنی میں تنقید نہیں کر سکتے۔ تنقید کے لئے جذباتی لگاؤ بے حد ضروری ہے۔

ہوسکتا ہے یہ اعتراض کیا جائے کہ جذباتی لگاؤ ہوگا تو پھر تنقید میں عدل وانصاف کس طرح ہو سکے گا۔جس لکھنے والے سے آپ محبت کرتے ہیں اس پر کھلے دل سے آپ تنقید کس طرح کر سکتے ہیں۔ اس طرح تو آپ کی تنقید میں جانب داری آجائے گی۔ جی ہاں یہی بات تو سوچنے کی ہے کہ کیا جانب داری کسی محبت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کیا آدمی نقد ونظر کے وقت اپنی محبت کے باعث اندھا ہو جاتا ہے۔ آج کل جو ہم اکثر یہ فریاد کرتے نظر آتے ہیں کہ تنقید میں ستائش باہمی کا سلسلہ چل پڑا ہے اس لئے لوگ نہ صحیح تنقید کرتے ہیں اور نہ پڑھنے والوں کو صحیح

تنقید پڑھنی نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا اب ہمیں سوچنا ہے کہ ادب میں ہمارے اس رویے کی کوئی حقیقی نفسیاتی وجہ ہے یا ہم یہ سب کچھ سطحیت کا شکار ہو کر کہہ رہے ہیں؟ جی ہاں انسانی نفسیات کا یہ ایک بہت ہی نازک پہلو ہے کہ آدمی اگر محض جذباتی رہے تو اس کے نفسیاتی حقائق میں کوئی گہرائی پیدا نہیں ہوتی۔ جذباتی ہونے کے باعث ایک وقتی گرما گرمی تو محسوس ہوتی ہے لیکن یہ گرما گرمی بہت کچھ خود غرضی سے قائم ہوتی ہے۔ یہی جو آجکل ستائش باہمی کا سلسلہ چلا ہوا ہے اس میں بھی ہمیں ایک بظاہر جوش تو نظر آتا ہے۔ لیکن اس جوش میں کوئی استقامت اس لئے نہیں کہ اس کی بنیاد میں کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے۔ چنانچہ انیس اپنے اس زیرِ بحث شعر میں اپنے چاہنے والوں کو اسی جذباتی جوش و سرگرمی سے محفوظ رکھنا چاہ رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میری شاعری کی وجہ سے کرتے ہیں تو یہ بہت عمدہ بات ہے لیکن میری شاعری کو سمجھنے کے لئے ذرا اپنے ذوقِ نقد و نظر میں گہرائی پیدا کیجئے۔ میرے کلام پر غور و فکر کے لئے وقت نکالیے۔ مجلسوں میں میرے مراثی سن کر جو آپ داد دیتے ہیں میں اس کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ لیکن یہ نقد و نظر کا مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا کہ آپ اسے سمجھ رہے ہیں۔

میر انیس نے اپنے اس ایک شعر میں صرف یہی کچھ نہیں کہا جس کا میں نے ابھی اظہار کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا ہے۔ ''محبت کا رشتہ نہایت ہے نازک'' صرف ایک مصرع ہی میں میر انیس نے محبت اور اس کے رشتے کی نزاکت کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کہہ دی ہیں جن پر ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جب آپ دنیا کی کسی چیز سے بھی محبت کرتے ہیں۔ تو اس شئے کے ساتھ اپنی ذات کی صورت میں اچھی طرح اپنے آپ کو ملوث کرتے ہیں۔

آپ کی پہلی شمولیت آپ کا پہلا ملوث ہونا تو اپنی محبوب شے کے ساتھ یہ ہے کہ آپ اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ آپ اس شے کو جس قدر زیادہ جانیں گے اسی نسبت سے آپ اس شے کے قریب ہوتے چلے جائیں گے۔ اپنی محبوب شے کے قریب ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ اس چیز پر قابض ہونا چاہتے ہیں بلکہ قربت کے معنی یہ ہیں کہ آپ اس محبوب شے کو وسیع سے وسیع تر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس محبوب شے کی گہرائیوں سے آشنا ہونا چاہتے ہیں۔ اس کی بلندیوں کا اندازہ کر کے اس محبوب شے کے گوناگوں امکانات ارتقاء کا جائزہ لینا آپ کا مقصد ہوتا ہے اور یہ سب کچھ کیوں ہے؟ اس لئے کہ آپ کی محبوب شے جس قدر بلند ہو گی جس قدر گہری اور جس قدر وسیع ہو گی۔ یہ شے آپ کی ذات کو اسی قدر وسیع گہرا اور بلند رکھے گی۔ دوسرے لفظوں میں اس محبوب شے کی وسعت گہرائی اور بلندی آپ کو اپنی ذات کی بلندیوں گہرائیوں اور وسعتوں کا احساس دلائے گی۔ اسی ایک مصرع میں محبت کے علاوہ اس محبت کے رشتے کی نزاکت کے بارے میں بھی انیس نے بات کی ہے۔ اور یہ نزاکت کی بات بھی سیدھے سادے طریقے سے نہیں کی۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ محبت کا رشتہ نازک ہوتا ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ محبت کا رشتہ نہایت نازک ہے۔ جس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ محبت کے رشتے میں جذباتی ہونے کی صورت نہیں۔ محبت کا رشتہ تو کچھ زیادہ ہی ہوشمندی کے ساتھ سنبھل کر عمل پیرا ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔

اس ضمن میں مزید کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ زیر بحث شعر میں محبت کا لفظ اپنے عام معنی کے علاوہ خاص معنی میں بھی استمال ہوا ہے بلکہ لفظ بھی کے بغیر استعمال ہوا ہے۔ یعنی لفظ محبت اس شعر میں ہوا ہی ہے خاص معنی میں استعمال' مطلب یہ ہے کہ اس شعر میں محبت کے معنی شعر و ادب

سے محبت ہے لیکن اس سے مراد یہ بھی نہیں ہے کہ شعر و ادب سے جو محبت ہوتی ہے اس میں سے ابنائے جنس کے ساتھ محبت کو ہم بالکل خارج کر دیتے ہیں یا کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کو شعر و ادب سے اتنا زیادہ لگاؤ ہے کہ آپ اسے اپنی زندگی کا ایک ضرور حصہ سمجھنے لگے ہیں تو پھر جو شخص اچھے اور عمدہ شعر تخلیق کرے گا آپ کو اس سے بھی ایک خاص قسم کی محبت ہو جائے گی۔ ویسے تو آرٹ اور فن کے لگاؤ کو ہم جلدی سے جنسی لگاؤ سے متعلق نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر ذرا غور کرتے ہیں تو آرٹ اور فن کے لگاؤ میں جنسی لگاؤ کی اعلیٰ صورت **Sublimation** کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ غالباً اسی خیال کے تحت ایک مغربی مفکر بارتھ نے لذتِ فکر کی بہت ہی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہہ دیا کہ کسی کتاب میں جب ہمیں کوئی لذیذ خیال نظر آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کسی دوشیزہ کی پتلون ادھڑ گئی ہے اور اس میں سے اس کے جسم کا کچھ حصہ نظر آ رہا ہے۔ بہرحال انسانی پیکر کے حسن اور انسانی خیال کے حسن اور کشش میں ایک تعلق اور مناسبت واضح ہے۔ اس مناسبت اور اعلیٰ صورت میں طہارت اور پاکیزگی کس وقت پیدا ہوتی ہے اس کو میر انیس نے اپنے ہی ایک اور مشہور شعر کے ذریعے اسطرح واضح کیا ہے۔

پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو
خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو

اب یہ ایک بالکل الگ مسئلہ ہے کہ ہم میر انیس کے اس شعر کو پڑھ کر اندر ہی اندر اور کچھ بظاہر بھی اس طرح مسکراتے ہیں جیسے طہارت و پاکیزگی اپنی جگہ، میر انیس نے حسینوں کو بھرپور نظر سے دیکھنے کا ایک بہانہ تراشا ہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں میر انیس نے یہ شعر بڑے خلوص کے ساتھ کہا ہے اور اس میں ان کی عام شوخی طبع کا ذرا سا بھی دخل نہیں۔

لیکن زیر بحث شعر میں میر انیس نے لفظ محبت کو نقد و نظر کی دنیا میں ایک بالکل نئے حوالے کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ یعنی اگر آپ کسی شاعر کی شاعری کو دل سے پسند کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسے محبت کے درجے تک پہنچا کر پسند کرتے ہیں۔ تو پھر آپ کو اس شاعری کے خالق کے عقیدے سے بھی محبت کرنی لازم ہو جائے گی۔ ورنہ اس کے بغیر آپ اس کی شاعری کی صحیح معنی میں داد نہیں دے سکیں گے۔ انسان سے انسان کی محبت کا رشتہ بھی نازک ہوتا ہے لیکن اتنا نازک نہیں ہوتا جتنا کہ ایک انسان کا ایک فن کے ساتھ رشتہ نازک ہوتا ہے۔اور وہ اس طرح کہ آپ کو اگر اپنے ہی طرح کے کسی انسان سے محبت ہے تو آپ اپنی بات کو اپنی محبت کو دوسرے انسان تک بیان کر کے سمجھا سکتے ہیں۔ اگر اس کو ایک بار آپ کی بات سمجھ میں نہیں آتی تو آپ دوبارہ سمجھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کسی شاعر کی شاعری سے محبت کرتے ہیں۔ تو آپ اس شاعری سے اپنی کسی بات کا اظہار نہیں کر سکتے۔ الاّ یہ کہ آپ یا تو اس شاعری کو الٹا سیدھا جس طرح چاہے سمجھ لیں یا پھر اس کو پڑھنا ترک کر دیں۔ میر انیس کی شاعری کے ضمن میں یہ بات بالکل صادق آتی ہے ان کی شاعری عقیدہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر آپ انیس کے عقیدے کو نہیں سمجھتے اور بات صرف سمجھنے تک ہی نہیں ہے اس عقیدے کو اپنے دل میں نہیں اتارتے تو آپ صحیح معنی میں انیس کی شاعری کی نہ تو داد دے سکتے ہیں اور نہ ہی انیس کی شاعری سے محبت کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ زیر بحث شعر کو میں ذیل میں پھر لکھ رہا ہوں۔

محبت کا رشتہ نہایت ہے نازک
مجھے کس لئے قدر داں کھینچتے ہیں

ممکن ہے یہاں آپ فرمائیں کہ اس شعر میں محبت کا لفظ عام محبت کے

لئے استعمال ہوا ہے اس کا تعلق شاعری سے شدید لگاؤ والی محبت کے تعلق سے نہیں ہے۔ لیکن جب ہم اس شعر کے دوسرے مصرع پر غور کرتے ہیں۔ اور اس مصرع کے خاص لفظ قدرداں پر پہنچتے ہیں تو ہمیں صاف پتا چلتا ہے کہ اس شعر کا تعلق عام محبت سے نہیں بلکہ شاعری سے لگاؤ والی بات ہے جس کی وجہ سے قدر داں کا لفظ ہمیں نقد و نظر کی طرف لے جاتا ہے یعنی میر انیس فرما رہے ہیں کہ میری شاعری کی وجہ سے لوگ میری قدر کرتے ہیں۔ یہ میرے قدر داں ہیں اسی لئے ان کی یہ قدر دانی محبت کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ اور وہ مجھے اپنے قریب لانا چاہتے ہیں۔ لیکن میر انیس کا کہنا یہ ہے کہ لوگ میری قدردانی شاعر ہونے کی وجہ سے تو ضرور کر رہے ہیں لیکن وہ میری شاعری کو پوری طرح نہیں سمجھ رہے اور اگر سمجھ بھی رہے ہیں تو عام شاعری کا اعلیٰ معیار تو ان کے سامنے ضرور ہے لیکن میری اس شاعری کے مغز یا روح یا عقیدہ کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ میر انیس مزید فریاد کرتے ہیں۔

یقیناً میری شاعری میں بلا کی فصاحت پائی جاتی ہے اس میں بلا کی بلاغت بھی ہے۔ اس میں صنائع و بدائع بھی خوب استعمال ہوئے ہیں' میری زبان بھی بہت عمدہ اور اعلیٰ ہے لیکن ان تمام باتوں سے میری شاعری کے پیکر کا'اس کی صورت' اس کی ہیئت کی عمدگی کا تو پتا چل رہا ہے مگر جب تک لوگ میری شاعری میں بیان کیے گئے عقیدہ کو نہیں سمجھیں گے میری شاعری عمدہ اور معیاری شاعری سے آگے کی چیز ثابت نہیں ہوسکتی۔

اسی لئے میر انیس شعر زیر بحث میں اپنے قدر دانوں سے یہ شکوہ کر رہے ہیں کہ وہ جو مجھ سے جذباتی ہو کر مل رہے ہیں۔ مجھے زور وشور سے اپنی طرف کھینچ رہے ہیں' اس میں ان کی جذباتی ہونے کا تو پتا چل رہا ہے۔اور اِس لئے یہ

اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ کہیں انکا زور شور ان کا یہ جذباتی ہونا ہنگامی اور وقتی نہ ہو کیونکہ اگر وہ میری شاعری کے عقیدہ کو سمجھ کر پھر میری قدر دانی کرتے تب ان سے اس طرح اپنے جذباتی ہونے کا اظہار نہ ہوتا اور وہ مجھے اس طرح نہ کھینچتے۔ جس طرح اب کھینچ رہے ہیں۔ ان کے اس طرح جذباتی ہونے سے یہ خدشہ بھی ہے کہ کہیں محبت کا یہ نازک رشتہ اس کھینچا تانی میں ٹوٹ ہی نہ جائے۔ یوں میر انیس شعر زیر بحث میں نقد و نظر کی ایک بالکل انوکھی اور نئی فضا کا تقاضا بھی کر رہے ہیں اور یہ فضا تخلیق بھی کر رہے ہیں۔ گویا میر انیس کے مطابق شعر و ادب تخلیق کرنے کے لئے اور اسی طرح اسے پرکھنے کے لئے ادیب اور قاری کا محض زبان کے اسرار و رموز سے واقف ہونا اور ان کو بروئے کار لانا ہی کافی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں شعر و ادب کی بنیاد زبان اور اس کے الفاظ کو ترتیب دینے پر ہی قائم ہے اور زبان ہی کے ذریعے افہام و تفہیم کے جملہ مراحل طے کئے جاتے ہیں۔ لیکن لکھی ہوئی چیز میں زبان کے جملہ اسرار و رموز کو جو چیز برقیاتی ہے اور اس میں تاثرات کی چکا چوند پیدا کرتی ہے وہ ادیب کا عقیدہ ہے جو اپنی جگہ ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہ عقیدہ ہی پڑھنے والے کو زبان سے محبت کرنا سکھاتا ہے یوں عقیدہ کے حوالے سے زبان کے ذریعے قاری کو جو محبت پہنچتی ہے اس میں زندگی کو سمجھنے اور اس سے پیار کرنے کی طاقت زیادہ ہوتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو شعر و ادب کی معرفت پیدا ہونے والی محبت قاری کے دل و دماغ میں جو گوناگوں تاثرات چھوڑتی ہے۔ ان کی وجہ سے ایک انسانی معاشرے میں یک جہتی کا ایک بالکل ہی انوکھا ماحول وجود میں آتا ہے۔

انیس کا تنقید میں محبت کے عمل دخل کا یہ ایک انوکھا نظریہ ہے۔ وہی بات کہ اس نظریۂ محبت کے تحت نقّاد جو فیصلے صادر کرے گا شعر و ادب کی تفہیم کے لئے

جو راہیں ہموار ہونگی۔ ان میں جانب داری کا شائبہ بھی نظر نہیں آئے گا۔ اس طرح کی محبت میں جانب داری یا کسی قسم کے ظلم کے بجائے عدل و انصاف کے پروان چڑھنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسی محبت کی چشم بینا میں کچھ اپنے ہی انداز کی بینائی فروغ پاتی ہے۔ اور آپ جانتے انیس کا عقیدہ پیغمبر آخر الزمان کا وہ عقیدۂ محبت ہے جس کو انسان اپنا لے تو حقیقت عظمیٰ سے اس کا رابطہ کبھی منقطع نہیں ہو سکتا۔' خنجر کی دھار کے نیچے بھی' جس کو حق ثابت کرنے کے لئے امام حسینؑ نواسۂ رسول نے کربلا میں انسان سے انسان کی محبت کو جاوداں ہونے کے تمام مراحل سے گزرنے کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ جو اپنی جگہ خاصے انوکھے ہیں۔ اور ہمیں ان پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مدینے سے کربلا تک اور پھر کربلا کے قیام کے دوران میں ہر مرحلہ پر امام حسین نے اپنے نانا کی امت کے لئے دعائیں مانگی ہیں۔ خیر و خوبی کی دعائیں جاوداں سلامتی کی دعائیں۔ امت کے پھلنے پھولنے کی دعائیں۔

دراصل جب ہم مراثیٔ انیس میں امام مظلوم کی دعاؤں کا مطالعہ امت مسلمہ کے حوالے سے کرتے ہیں تو اسی وقت ہمیں صحیح معنی میں پتا چلتا ہے کہ تنقید میں محبت کے عمل دخل سے کیا کیا معانی فروغ پاتے ہیں۔ جانب داری تو نہ کہیں ان معانی میں نظر آتی ہے۔ اور نہ ان گہرے جذبات کے اظہار میں جس کی فراوانی سے ہمارے جذبات خیر سگالی کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر مراثی انیس کے مطالعہ سے امت مسلمہ کے لئے ہمارے دلوں میں وہ پیار اور محبت پیدا نہیں ہوتی جس کا اظہار میر انیس نے اپنے ان مراحل میں کیا ہے۔ تو سمجھ لیجئے ہم نے مراثی انیس کا کوئی مطالعہ نہیں کیا اور کیا بھی تو بہت سرسری طور پر مجھے یہ کہنے میں ہرگز کوئی باک نہیں۔ کہ سانحۂ کربلا کو سامنے رکھ کر شہیدان کربلا کی مظلومیت کو بھی

پوری دردمندی سے یاد کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ پوری امت مسلمہ کے لئے دعا خیر کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لئے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے لیکن وہی بات کہ یہ کام مشکل ہی ہے ناممکن تو نہیں۔ جہاں تک اس مشکل کو حل کرنے کے لئے حوصلہ پیدا کرنے کا سوال ہے اس کے لئے ہم دشواری کی بات تو کر سکتے ہیں۔ ناممکن والی بات یہاں بھی نہیں ہے۔ اگر ہم اس مسئلہ پر ذرا توجہ کریں تو اس کے تمام عقدے حل ہوتے نظر آتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بے تعصب ہو کر ہم تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں اور تعصّبات سے بلند ہونے کی شرط یہ ہے کہ ہمارے والدین اور بزرگوں نے جو اپنی بے خبری کے ساتھ تاریخ کی غلط باتیں ہمارے کانوں میں نچوڑی ہیں۔ انہیں اپنے ذہن سے باہر نکال ڈالیں۔ مطالعۂ تاریخ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے بزرگوں کی یہی ناروا باتیں ہیں جو تعصبات بن کر ہمیں انصاف سے تاریخ کا مطالعہ نہیں کرتے دیتیں۔

اور یہ تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جذبۂ محبت اور شعور محبت دونوں ہی کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ ہم حق بات کہنے سے کبھی خوف نہ کھائیں۔ شاید آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ جذبۂ محبت اور شعور محبت دونوں ہی کی بنیاد عدل و انصاف پر ہے۔ عدل و انصاف پر ہے۔ عدل و انصاف کے بغیر نہ کبھی جذبۂ محبت ابھر سکتا ہے۔ اور نہ کبھی محبت کا شعور فروغ پاتا ہے۔ آپ کے دل میں کسی کی محبت اسی وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب آپ کو اپنے محبوب شخص میں ارتقاء کے امکانات نمایاں نظر آتے ہیں۔ اور یوں محبت' مسلسل آگے بڑھنے کا عمل قرار پاتی ہے۔اور اس کا شعور یعنی محبت کا شعور بھی اسی وقت آپ کے ذہن میں جنم لیتا ہے جب آپ دیکھتے ہیں۔ کہ آپ کے محبوب کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ محبوب کے حوالے سے ایک عاشق میں حق بات کہنے کی جرأت اسی لئے

پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کے لئے یہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کے محبوب کے قدم آگے نہ بڑھ رہے ہوں اور جب وہ یعنی عاشق دیکھتا ہے کہ اس کے محبوب سے کسی قسم کی کوتاہی یا عدم توجہی سرزد ہو رہی ہے۔ تو وہ اس کو فوراً باخبر کرتا ہے۔ لیکن وہی بات کہ محبوب کا اپنے چاہنے والے کی حق بات سن لینا اس طرح عاشق کا محبوب سے بے خوف ہو کر بات کرنا ۔ انسانی رشتوں کے ضمن میں یہ سارے معاملات خاصے نازک ہوتے ہیں۔ ان معاملات کو سنبھالنا یا ان معاملات میں سنبھلنا دونوں ہی کام خاصے نازک ہیں۔ اور اسی نزاکت پر متوجہ ہونے کے لئے انیس محبت کے رشتے کے نازک ہونے کا ذکر کر رہے ہیں اور اپنے قدر دانوں کو باخبر کر رہے ہیں۔ کہ نقد و نظر میں محبت کا ہونا ضروری تو ہے لیکن نقد و نظر میں محبت کے نازک رشتہ کو قائم رکھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں محبت سے بھرپور تنقید کا ہم تصور بھی کر سکتے ہیں۔ بلکہ اس کے امکان میں بھی ہمیں کوئی شک نہیں۔ لیکن وہی بات کہ یہ آسان کام یقیناً نہیں ہے۔ اور پھر جہاںؔ شاعری میں فن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ محبت کے جذبات کی پاسداری بھی لازم آتی ہو اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عقیدہ کا سوال بھی موجود ہو تو وہاں تنقید کا کام قطعی طور پر آسان نہیں رہ جاتا۔ اسی لئے انیس کہہ رہے ہیں کہ میرے کلام کے لئے جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جذباتی نہ ہونے کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ آپ مجھ سے محبت نہ کریں۔ نقد و نظر میں محبت جانبداری کا خیال تک نہیں کر سکتی۔ لیکن اس شدت سے محبت کا یہ تقاضا ہوتا ہے۔ کہ تعصّبات سے بلند ہو کر آپ کسی مسئلہ پر متوجہ ہوں تب جا کر صحیح معنی میں کوئی بات بنتی ہے۔

شعرِ انیس میں اُلفت کا ایک معنی خیز اظہار

صاحب نور اللغات کا کہنا ہے کہ محبت اور الفت میں یہ فرق ہے کہ محبت خودبخود ہوجاتی ہے اور الفت میں دوستی اور چاہت کے لئے عملاً قدم اٹھانے پڑتے ہیں۔ پلیٹس الفت کو Intimacy قرار دیتے ہیں یعنی کسی کے بہت قریب آ جانا یا کسی کو قریب کر لینا۔ اتنا قریب کہ پھر ہم ایک دوسرے کی ذات میں جھانک سکتے ہیں۔ مگر کسی کو اپنا بنانے میں، کسی کے قریب آنے میں انسان کو بہت سے مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس تگ و دو اور جدوجہد سے انسان کے اختیار کا پتا بھی تو چلتا ہے۔ آپ کی محبت سے آپ کے اختیار کا پتا نہیں چلے گا البتہ آپ کسی سے یا کسی چیز سے کس قدر الفت کرتے ہیں اس سے آپ کے بااختیار ہونے کا علم ضرور حاصل ہو سکتا ہے۔ لفظ الفت کے اسی معنی کے پیش نظر میر انیس نے سلام کے اپنے ایک شعر میں الفت کی ایک عجیب و غریب صورت بیان فرمائی ہے۔ اور یہ صورت عجیب و غریب ہی نہیں معنی خیز بھی ہے۔ میر انیس کا وہ شعر یہ ہے۔

یہ الفتیں بھی ہیں دنیا میں یادگار اے مرگ
مرا خیال تجھے اور ترا خیال مجھے

لفظ الفت کے ان معنی کے پیش نظر جن کا اظہار میں نے مختلف لغات کے حوالے سے ابھی ابھی کیا ہے۔ یہ پتا چلتا ہے کہ موت کے بارے میں آدمی اپنا کچھ اختیار بھی استعمال کر سکتا ہے۔ یہ ہزار اٹل سہی لیکن اس سے نمٹنے کے لئے' اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آدمی کے اپنے اختیار میں بھی کچھ باتیں ہیں ۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ موت سے ہم الفت کر سکتے ہیں۔ یعنی موت کو منفی معنی کے علاوہ مثبت معنی میں بھی لیا جا سکتا ہے۔ موت ہزار اٹل سہی لیکن یہ تو آپ کے اپنے اختیار میں ہے کہ آپ اس کا ڈر کر مقابلہ کرتے ہیں یا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ یا سوچ سمجھ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ ان صورتوں میں سے پہلی صورت یعنی ڈر کر مقابلہ کرنا بالکل بے معنی ہے کہ جب ہم کسی چیز سے ڈر ہی رہے ہیں تو پھر اس کا مقابلہ کیا کر سکتے ہیں۔ رہی دوسری صورت تو ڈٹ کر مقابلہ کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن سوچے سمجھے بغیر ڈٹ جانا مختصر وقت کے لئے تو ممکن ہے لیکن ایک معقول مدت کے لئے ڈٹ جانے کی خاطر ہمیں اپنی سوچ سمجھ سے کام لینا پڑے گا۔ لہٰذا صحیح مقابلہ سوچ سمجھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ گویا موت ہزار اٹل سہی اس کے بارے میں غور و خوض کرنے سے یہ موت بہت سے معنی کی حامل ہو سکتی ہے۔ اور جب موت میں ہمیں معانی نظر آنے لگتے ہیں۔ تو پھر ہمارے لئے موت کا مطلب یکسر بدل جاتا ہے۔ اب ذرا انیس کے شعر زیر بحث کو سامنے لائیے۔

یہ الفتیں بھی ہیں دنیا میں یادگار اے مرگ
مرا خیال تجھے اور ترا خیال مجھے

دیکھ لیجئے جب ہم موت سے الفت کرتے ہیں اس پر غور کرتے ہیں تو اس کے معنی ہی یکسر نہیں بدل جاتے خود موت اپنی ذات میں بدلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اگر براہ راست موت پر غور کرتے ہیں۔ تو چکبست کا یہ مشہور شعر فوراً

ہمارے ذہن میں آتا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشان ہونا

لیکن اس شعر کے تحت موت ہمارے لئے مکینیکل سی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یوں چکبست کا یہ مشہور شعر اپنی جگہ عمدہ بھی ہے اور بامعنی بھی مگر یہ انیس کے شعر زیر بحث کے سامنے گرد ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حساب کتاب کی زندگی ایک حد تک تو اپنی ذات میں ایک خاص کشش رکھتی ہے۔ اس کے بعد اس سے متعلق حساب کتاب کی چیز ایک محدود مسلمہ حقیقت بن جاتی ہے۔ اور اس طرح موت میں جو زندگی کے حوالے سے ایک ماورائیت اور لامحدودیت پائی جاتی ہے وہ باقی نہیں رہتی۔ اس شعر کے تحت زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب عناصر یعنی اگر مادی عناصر کو ایک خاص انداز میں ترتیب دے لیا جائے تو زندگی ظہور میں آ جاتی ہے۔ اور اگر یہ ترتیب باقی نہ رہے تو زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بات اپنی حد تک ٹھیک ہے۔ اسی لئے ہمیں یہ شعر اپیل بھی کرتا ہے۔ لیکن جب ہم زندگی اور موت پر ذرا کھل کر غور کرتے ہیں۔ تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی اور موت سے ایک ترتیب کا بننا اور بگڑنا ہی نہیں ہے کچھ اور بھی ہے۔ یہ ''کچھ اور'' جو ہے دراصل یہ موت اور زندگی دونوں کے امکانات پر ہمیں غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ چکبست کا شعر اور اس کا مادی عناصر کی ترتیب کو زندگی کہنا اور اس ترتیب کے بکھر جانے کو موت کہنا ہمیں وسعت کے ساتھ غور و فکر کی دعوت نہیں دیتا۔ اس شعر کو پڑھ کر ہمیں ایک خاص قسم کا اطمینان حاصل ہوتا ہے جس کے تحت ہم موت اور زندگی کے بارے میں زیادہ سوچنے کو لاشعوری طور پر مناسب نہیں سمجھتے۔ ظاہر ہے اس طرح زندگی اور موت پر ہمارا نہ سوچنا کوئی عمدہ بات کسی طرح بھی قرار

نہیں دیا جا سکتا۔ جبکہ میر انیس کا شعر ہمیں مسلسل دعوتِ غور و فکر دے رہا ہے۔

میر انیس کے شعر زیر بحث میں سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یہ ہمیں نہ صرف زندگی پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے' موت پر دعوتِ غور و فکر کے ساتھ ساتھ اس سے الفت کرنے کے ایک تجربے کی بھی دعوت دے رہا ہے۔ یعنی موت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو اٹل جان کر آدمی اس کے بارے میں کوئی غور و فکر ہی نہ کرے اور یوں موت کے بارے میں بالکل بے عمل ہو کر بیٹھ جائے یعنی یہ سوچنے لگے کہ موت کو ایک دن آنا تو ہے پھر اس کے بارے میں کچھ سوچنے کی کیا ضرورت ہے موت آئے گی اور ہم مر جائیں گے ۔ لیکن یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ یوں اس میں کوئی شک نہیں موت بھی آئے گی اور ہم مر بھی جائیں گے لیکن کیا موت کے آنے سے قبل ہم اس سے دوستی اور الفت نہیں کر سکتے۔ کیا اس کی حقیقت کو شعوری طور پر ہمیں تسلیم نہیں کر لینا چاہیئے۔ موت کو شعوری طور پر تسلیم کر لینے میں اور کچھ سوچے سمجھے بغیر موت کو تسلیم کر لینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ موت کو شعوری طور پر تسلیم کر لینے سے موت بڑی حد تک ہمارے دائرہ اختیار میں آجاتی ہے۔ موت اپنے وقت کے اعتبار ہی سے اٹل ہے یعنی اجل ہے' موت کے مقررہ وقت پر ہمیں کس طرح مرنا چاہیئے۔ اس بارے میں ہم پر کوئی قدغن نہیں اور اس طرح کسی قسم کے قدغن کا ہم پر نہ لگنا ہمارے اختیار کو بڑی حد تک وسیع کرتا ہے۔ اور انیس کا زیر بحث شعر ہمیں یہی احساس دلا رہا ہے اور صرف احساس ہی نہیں دلا رہا ہے ہم پر فکر و عمل کی راہیں بھی کھول رہا ہے۔ موت سے الفت کرو اور پھر اس الفت کو یادگار بنادو۔ جیسا کہ زیر بحث شعر کے پہلے مصرعے میں انیس فرما رہے ہیں۔ ''یہ الفتیں بھی ہیں دنیا میں یادگار اے مرگ!'' یعنی موت سے الفت کر کے موت کو اپنی مرضی اور منشا کے مطابق نئے سے نئے حیات افروز معانی سے مالا مال

کر دو جیسا کہ کربلا والوں نے اپنی الفت مرگ کو یادگار بنا دیا۔ یہاں شعر زیر بحث کے دوسرے مصرعے کے حوالے سے یہ پوچھا جا سکتا ہے۔ موت کا خیال آدمی تو رکھ سکتا ہے۔ موت آدمی کا کیا خیال رکھ سکتی ہے۔ کیونکہ شعرزیر بحث کا دوسرا مصرع واضح طور پر کہہ رہا ہے۔''میرا خیال تجھے اور ترا خیال مجھے۔'' یعنی میں ہی موت کا خیال نہیں رکھتا موت بھی میرا خیال رکھ رہی ہے۔ اور یوں دونوں کا اس طرح ایک دوسرے کا خیال رکھنا ایک طرح کی الفت ہے جو یادگار کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

اب یہاں پھر وہی سوال ایک نئے انداز میں پیدا ہوتا ہے۔ کہ انسان تو موت کا خیال رکھتا ہے لیکن موت انسان کا کس طرح خیال رکھتی ہے؟ ذرا غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ جس طرح انسان موت کے اٹل ہونے کے باعث اس کا خیال رکھتا ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح موت کا اٹل ہونا ہی موت کی طرف سے انسان کا خیال رکھنا ہے As sure as death والی انگریزی کی بات تو آپ نے سنی ہوگی یعنی موت سے بڑھ کر اس دنیا میں کوئی چیز یقینی نہیں ہے۔اسی لئے عربی میں اور قرآن پاک میں موت کو یقین کہا گیا ہے۔ گویا موت کا یقینی ہونا ہی انسان کا خیال رکھنا ہے کہ دنیا میں ہر کسی قسم کی مخلوق انسان کو دھوکا دے سکتی ہے لیکن موت انسان کو کبھی دھوکا نہیں دیتی۔ وہ ایک طرح سے اس کی یعنی انسان کی پابند ہے۔ اس نکتے کو مزید سمجھنے کے لئے گذارش کر رہا ہوں کہ موت انسان کی اس طرح پابند ہے کہ جب تک موت کا معینہ وقت نہیں آلیتا انسان کو اختیار ہے کہ وہ اپنی زندگی کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ طرح طرح کی رکاوٹیں جو انسان کے استعمال اختیار میں حائل ہوتی ہیں۔ ان کو انسان اپنے عزم و ہمت سے دور کر سکتا ہے۔ بہرحال انسان کو جو عرصۂ حیات دیا گیا ہے۔ اسے

انسان خود منحصر کر دے، خودکشی وغیرہ کے ذریعے تو یہ دوسری بات ہے ورنہ قدرت کی طرف سے اسے پورا پورا اختیار ہے۔ یہ نکتہ انسان کے اختیار کے بہت سے مفاہیم و مطالب کو واضح کرنے اور ان کے لئے راستے کھولنے کا سامان مہیا کرتا ہے۔ جبر و اختیار کے بہت سے رموز بھی اسی ضمن میں آتے ہیں۔ موت کا وقت معینہ انسان کی بہت سی صلاحیتوں کو بھی واضح کرنے کا ایک سبب قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہی بات کہ جب انسان موت سے الفت کرتا ہے یعنی اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ موت بھی انسان کو سمجھنے کا ایک ذریعہ بن جاتی ہے۔

آپ جانتے ہیں فانی بدایوانی ہمارے اردو کے ان شعرا میں سے ہیں بلکہ ایک طرح واحد شاعر ہیں جنہوں نے موت کے مضمون پر خاصی توجہ دی ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ جس طرح انیس نے شعر زیر بحث میں موت کے ساتھ انسان کے تعلق کی بات کی ہے اور اس تعلق کو الفت کے ذریعے ایک بلندی عطا کی ہے وہ ہمیں فانی کے ہاں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ فانی زیادہ سے زیادہ موت سے اس انداز میں مخاطب ہوتے ہیں۔

اے اجل اے جانِ فانی تو نے یہ کیا کر دیا
مار ڈالا مرنے والوں کو کہ اچھا کر دیا

اجل کو یعنی موت کے وقت معینہ کو فانی اپنی جان تو کہہ رہے ہیں لیکن ان کا مضمون اس سے آگے نہیں بڑھ سکا جیسا کہ عام لوگ دکھی لوگوں کے بارے میں کہہ دیا کرتے ہیں کہ بھائی وہ مر گیا گیا اچھا ہوا زندگی کے دکھوں سے اس کی جان چھوٹ گئی۔ موت کے بارے میں یہ خیال بہت عامیانہ بھی ہے اور اس میں کسی قسم کی بلندی بھی نہیں پائی جاتی۔ جبکہ میر انیس کا زیر بحث شعر تو موت سے باقاعدہ سوچ سمجھ کر نمٹنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ اور صرف ترغیب نہیں دے رہا

یہ بھی بتا رہا ہے کہ موت سے سوچ سمجھ کر نمٹا جائے تو پھر موت ایک یادگار کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ لیکن موت کے بارے میں اس بلندی اور اس جمالیاتی انداز میں آدمی اسی وقت سوچ سکتا ہے جب اس کا عقیدہ زندگی کے بارے میں کوئی بلند اور جمالیاتی انداز لئے ہوئے ہو۔ میر انیس اپنے عقیدہ کے تحت موت کو ایک جبری اور روٹین کی چیز نہیں سمجھتے۔ موت تو زندگی کی طرح ایک مخلوق ہے اور دنیا کی ہر مخلوق اپنا کوئی نہ کوئی بلند مقصد رکھتی ہے۔ چنانچہ موت اور زندگی سے بڑھ کر کوئی مخلوق اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور ان سے بڑھ کر کسی مخلوق کا مقصد اس قدر بلند اور بامقصد کیسے ہو سکتا ہے اور پھر موت زندگی کی ضد قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ تو زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے اپنا فرض ادا کرتی ہے۔ اور یہ فرض اسی حساب سے بلند تر قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس حساب سے کوئی انسان اس فرض کے بارے میں سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرتا ہے۔

اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کہ میدان کربلا میں جس طرح امام عالی مقام اور ان کے رفقاء نے موت کے بارے میں سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا اس کی مثال لاریب ہمیں آج تک کسی اور جگہ نہیں ملی۔ موت سے الفت کرنا واقعی کوئی کربلا والوں سے پوچھے۔ بلکہ یہ پوچھنا بذاتِ خود اتنا بڑا سوال ہے کہ آدمی کو اس سوال کا جواب ملنے سے بیشتر خود سوال کرنے کا عمل اس کی ذات کے لئے اس قدر معنی خیز ہے کہ اس کی سوچ میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اور پھر ایسی روشنی انسان کی عقل کو کسی دوسرے سوال سے آج تک نصیب بھی نہیں ہو سکی۔ ہم موت سے الفت کرتے ہیں۔ تو اس کے خالق سے بھی محبت کرنے کے عمل میں ایک نئی جہت پیدا ہوتی ہے۔ موت کا خالی پھیکا خوف ظاہر ہے بہت ہی بے معنی چیز ہے اور ہم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ موت کا خالی پھیکا خوف ہمیں جہالت

کے ایسے گڑھے میں لا پھینکتا ہے جس سے نکلنا کم از کم ہمارے بس میں نہیں رہتا۔ یہ تو زندگی کا اپنا رنگ رس ہے جو انسان کو موت کے خوف کے گڑھے سے وقتی طور پر نکال لاتا ہے اور دوبارہ اسی گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔ البتہ اگر موت سے الفت کی جائے' اس کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اس عمل سے خود ایک روشنی پھوٹتی ہے جو ہمیں کچھ اپنے ہی انداز کا علم عطا کرتی ہے۔ فانی ہی کا ایک شعر اور ملاحظہ فرمایئے۔

دنیا میں حال آمد و رفتِ بشر نہ پوچھ
بے اختیار آکے رہا' بے خبر گیا

اب انیس کے شعر زیر بحث پر غور فرمایئے۔ اگر آدمی موت سے الفت کرے یعنی اس پر صدق دل سے غور کرے تو پھر وہ فانی کے انداز کی بات نہیں کہہ سکتا موت پر غور کرنے کے بعد نہ تو انسان کا اس دنیا میں آنا بے معنی اور بے اختیار رہ جاتا ہے اور نہ ہی وہ بے خبر رہ کر اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ فانی کے شعر میں فکر نہیں ہے۔ فانی کے شعر میں فکر ہے لیکن چونکہ موت پر صدق دل کے ساتھ فکر نہیں ہے اس لئے اس فکر میں سطحیت آگئی ہے۔ انسان غور و فکر سے کام لے تو پھر وہ نہ بے اختیار رہتا ہے اور نہ ہی اس دنیا سے بے خبر جاتا ہے۔

فانؔی بہت کرتے ہیں تو پھر موت کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

رہ جائے کیوں فنا کا ہنگامہ نامکمل
کچھ میری زندگی سے لے لیجئے بلائیں

یعنی انسان کے مصائب سے اس کی موت پر رونق ہو جاتی ہے مگر وہی بات کہ فانی کے اس شعر میں شعریت تو ضرور ہے لیکن اس شعریت میں غور و فکر کا

وہ سامان نہیں ہے جس سے انسان کے کچھ اختیار کا پتا چلے جیسا کہ میر انیس کے شعر زیر بحث سے انسان کے اختیار کی جی ہاں موت سے متعلق انسان کے اختیار کی بڑی تابناک قسم کی جدوجہد کا پتا چلتا ہے۔ میر انیس تو واضح طور پر کہہ رہے ہیں کہ انسان کو موت سے الفت کرنی چاہیئے دوسرے لفظوں میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا چاہیئے جس طرح کربلا والوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اللہ کی عطا کردہ زندگی کی آبرو کو ہزار چند کرکے دکھا دیا۔ ذرا مزید غور سے دیکھا جائے تو میر انیس کا یہ شعر ہمیں تاریخ کو آنکھیں کھول کر پڑھنے کی دعوت بھی دے رہا ہے۔ یہ الفتیں بھی ہیں دنیا میں یادگار اے مرگ۔ اس مصرع میں لفظ یادگار واضح طور پر تاریخ کے مطالعے کے لئے ہمیں اکسا رہا ہے۔ ہم مسلمان من حیث القوم تاریخ کے مطالعہ سے بھی گریزاں رہتے چلے آئے ہیں۔ ہمیں اس بندش کو بھی توڑنا ہے۔ اور اپنی تاریخ کے یادگار لمحوں کو اپنے ذہنوں کا حصہ بنانا ہے۔ کہ اس کے بغیر ہم اسلامی روح کو اپنے دلوں میں اتارنے کے قابل نہیں بن سکتے۔ مراثی انیس میں موت کو یادگار بنانے کی جگہ جگہ مثالیں اس آن بان کے ساتھ نظر آتی ہیں کہ آپ کو میر انیس کا یہ شعر اپنے اجمال کے باوجود تفصیل کے بے پناہ حسن کا حامل نظر آئے گا۔

اب ذرا میں میر انیس کے مرثیہ سے ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں۔ امام عالی مقام کا آخری وقت ہے۔ امام مظلوم دشمنوں سے آخری جنگ بھی کر چکے ہیں۔ زخموں سے امام کا بدن چور ہے۔ آپ جانتے ہیں گھوڑا ویسے ہی ایک حساس جانور ہے اور پھر گھوڑا بھی وہ گھوڑا جو ہمارے نبی آخر الزمان کی سواری رہ چکا ہو۔ اس لئے امام مظلوم کو زمین پر آنے سے ایک طرح روک رہا ہے۔ جس پر امام فرما رہے ہیں۔

ہے عصر کا ہنگام مناسب ہے اترنا　　اس خاک پہ ہے شکر کا سجدہ ہمیں کرنا

گو مرحلہ صعب ہے دنیا سے گزرنا سجدے میں کٹے سر کہ سعادت ہے یہ مرنا
طاعت میں خدا کی نہیں صرفہ تن و سر کا
ذی حق ہیں ہمیں اس کے کہ ورثہ ہے پدر کا

اس کے بعد امام مظلوم گھوڑے کی زین سے جو نیچے آنے لگے اس دوران میں امام مظلوم پر کیا کچھ گذری اور امام نے اس کو اپنی ذات پر کس طرح برداشت کیا اس ضمن میں اسی مرثیے کے چند بند ملاحظہ فرمایئے۔ اور دیکھئے نواسۂ رسول نے موت کو کس طرح گلے لگایا۔

یہ کہہ کے جو سر کا اسد اللہ کا جایا اک تیر جبیں پر بن اشعب نے لگایا
فریاد نے زہرا کی دو عالم کو ہلایا پیکانِ سہ پہلو عقب سر نکل آیا
تڑپے نہ زہے صبر امام دو جہاں کا
سوفار نے بوسہ لیا سجدے کے نشاں کا

حضرت نے جبیں سے ابھی کھینچا تھا نہ وہ تیر جو حر پہ لگی تیغ بن مالک بے پیر
ابرو تک اتر کر جو اٹھی ظلم کی شمشیر سر تھام کے بس بیٹھ گئے خاک پہ شبیر
چلائے ملک دیکھ کے خوں سبط نبی کا
تھا حال یہی مسجد کوفہ میں علی کا

بیٹھے جو سوئے قبلہ دو زانو شہہ بے پر جھکتے تھے کبھی غش میں اٹھاتے تھے کبھی سر
تھے ذکر خدا میں کہ لگا تیر دہن پر یاقوت بنے ڈوب کے خوں میں لب اطہر
بہہ آیا لہو تابہ زنخدانِ مبارک
ٹھنڈے ہوئے دو گوہر دندانِ مبارک

دیکھ لیجئے میر انیس ایک طرح یہ تاریخ بیان کر رہے ہیں جو باقاعدہ وہ امام حسین پر وار کرنے والوں کے نام لے کر بتا رہے ہیں۔

نیزے کا بنِ وہب نے پہلو پہ کیا وار کاندھے پہ چلی ساتھ زرارہ کی بھی تلوار

ناوک بن کاہل کا کلیجے کے ہوا پار بازو میں در آیا تیر خولیِ خونخوار
تلوار سے وقفہ نہ ملا چند نَفَس کا
دم رُک گیا نیزہ جو لگا ابن اُنس کا

یقیناً آپ ملاحظہ فرما رہے ہونگے کہ کس طرح میر انیس ایک ایک کر کے امام مظلوم پروار کرنے والوں کا نام لے رہے ہیں اور کس طرح ہمارے سامنے امام کی مظلومیت کا نقشہ ابھرتا چلا آرہا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ امام کے صبر اور برداشت کا بھی پتا چل رہا ہے۔ اور راہِ خدا میں جان دینے کی آن بان بھی ہم پر واضح ہو رہی ہے بس صرف ایک بند مزید ملاحظہ فرمائیے جو مندرجہ بالا بندوں سے آگے کا بند ہے۔

تھرا کے جھکے سجدۂ حق میں شہ ابرار شورِ دُہلِ فتح ہوا فوج میں اِک بار
خوش ہوکے پکارا پسرِ سعد جفاکار اے خولی دشیت وبن ذی الجوشنِ جرار
آخر ہے بس اب کام امامِ ازلی کا
سرکاٹ لو سب مل کے حسین ابن علی کا

ایک طرف صبر و شکر کی انتہا ہے تو دوسری طرف ظلم و ستم کی انتہا میر انیس کے مراثی میں اس طرح کا منظر بار بار ہمارے سامنے آتا ہے لیکن ہر منظر کا انداز اس منظر کے ہیرو کے باعث بدل جاتا ہے لیکن ان تمام مناظر میں ایک بات بڑی وحدت کے ساتھ نظر آتی ہے کہ موت کو اس سے الفت کے باعث بہت ہی کام کی چیز بنا ڈالا ہے۔ غالب کے بقول نہ ہو مرنا جینا کا مزا کیا۔ لیکن اس مرنے میں یا اس سے قبل غالب کے شعر والی ہوس کہیں نظر نہیں آتی۔ البتہ نشاطِ کار اپنے عروج پر ضرور نظر آتی ہے۔ ویسے بھی یہ نشاطِ کار عام آدمی کے نشاطِ کار سے مختلف ہے کہ اس نشاط میں روحانی اور مادّی قوتوں کا ایسا امتزاج ملتا ہے جس کی مثال ہمیں فضائے کربلاء کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔

زندگی کا خیال

(میر انیس کا ایک شعر ایک طرف اور ان کے جملہ مراثی دوسری طرف)

سب سے پہلے میر انیس کے سلام کا وہ مشہور شعر ملاحظہ فرما لیجئے جو آج کی گفتگو کا موضوع ہے۔ اور جس کے پس منظر میں میر انیس کے جملہ مراثی ایک عجیب صورتِ حال سے دوچار ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ شعر یہ ہے۔

انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

اس شعر کا مضمون نہ صرف گہرا' بلند اور وسیع ہے اس سے بھی کہیں زیادہ یہ نازک ہے۔ لیکن اس تمام گہرائی' بلندی اور وسعت کے باوجود اس شعر کا کمال یہ ہے کہ اس شعر کی گہرائی' بلندی اور وسعت کو ایک عام آدمی بھی محسوس کرتا ہے۔ البتہ اس شعر کی نزاکت کو محسوس کرنے کے لئے قاری کو ذرا چوکنا اور ہوشیار ہونے کی ضرورت ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس شعر کی گہرائی بلندی اور وسعت تو یہ ہے کہ اس شعر کا تعلق زندگی کی ناپائیداری سے ہے اور اس شعر کی نزاکت یہ ہے کہ زندگی کی ناپائداری زندگی کی بے شمار اداؤں سے تعلق رکھتی ہے۔

زندگی کے ناپائدار ہونے کے باوصف کوئی جلدی سے زندگی کو اس قدر ناپائدار نہیں سمجھتا جس قدر کہ واقعی زندگی ناپائدار معلوم نہیں ہوتی۔ جتنی کہ وہ واقعی ہے اور شعر کی نازکی یہ ہے کہ جب تک آپ چراغ اور ہوا کے تعلق کو نہیں سمجھتے پورا شعر سمجھ میں آنے کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا۔ اور ظاہر ہے جب شعر سمجھ میں ہی نہیں آئے گا۔ تو اس کی بلندی گہرائی اور وسعت کا احساس کسی منزل کی طرف آپ کو کیا اشارہ کر سکتا ہے۔ سب سے پہلے اس شعر کی جو بات عام قاری کو بھی متاثر کرتی ہے وہ یہی ہے ''دم کا بھروسا نہیں'' یعنی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہم جو سانس لے رہے ہیں اس کے بارے میں پورے وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک سانس کے بعد دوسرا سانس آتا بھی ہے یا نہیں۔ اور اسی بے اعتباری کی وجہ سے اس شعر کی گہرائی وغیرہ کا احساس بھی ہوتا ہے آپ جانتے ہیں۔ عموماً نصیحت کے طور پر جو کہا جاتا ہے کہ آدمی کو موت کا خیال رکھنا چاہئے یا موت کو یاد رکھنا چاہئے اس کا مطلب بھی دراصل یہی ہے کہ موت کے خیال کی وجہ سے ایک تو آدمی کو سوچنے کی عادت پڑتی ہے دوسرے موت کا خیال آدمی کی ذہنی صلاحیتوں کو تیز اور گہرا کرتا ہے۔ موت کا خیال آدمی کو غم گین کرتا ہے اور اس غم گینی کی وجہ سے آدمی کی فکر میں مایوسی پیدا ہونے کا بھی خطرہ اور اندیشہ ہوتا ہے لیکن آدمی نارمل حال میں ہے تو یہ خطرہ اور اندیشہ کم ہوتا ہے کیونکہ نارمل صورت میں موت ایک اٹل چیز کے طور پر سامنے آتی ہے تو اس سے مایوسی کے بجائے قوت برداشت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی جب ایک چیز اٹل ہے تو اس سے مایوسی پیدا کیوں ہو کیوں نہ اٹل چیز کو ایک حقیقت تسلیم کر کے اس کا مقابلہ کیا جائے اور جیسے ہی مقابلے کا یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے آدمی میں شعوری اور جذباتی اعتبار سے ایک عجیب انداز کی توانائی پیدا ہوتی ہے جس کے باعث اس میں یعنی آدمی میں جینے کا حوصلہ نمو پاتا ہے۔ اس

طرح دیکھا جائے تو موت کا خیال آدمی کے فکر وعمل میں توازن اور اعتدال پیدا کرتا ہے۔

میں نے شعر زیر بحث کے بارے میں جو یہ کہا ہے کہ اس شعر کی نازکی کا پتا صحیح معنی میں اسی وقت چلتا ہے۔ جب ہم چراغ اور ہوا کے رشتے کے نزاکت کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہوا جہاں چراغ کو بجھاتی ہے وہاں اس کے روشن رکھنے میں بھی اس کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر چراغ اور ہوا کے رشتے میں اعتدال اور توازن کو پیش نظر رکھا جائے۔ تو پھر جلدی سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا میں نے جلدی سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ ایک خاص وقت پر آ کر خرابی پیدا ہونا تو اس ناپائیدار دنیا کی فطرت ہے بلکہ آپ اسے اصول بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ اگر کائنات کی اشیاء میں خاص وقت پر خرابی پیدا نہ ہو تو نہ صرف اس کا ارتقا رک جائے بلکہ امکانات ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ ادھر اس دنیا میں ہزار خرابیاں پیدا ہو جائیں۔ اس کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے۔

ہر ذی حیات اپنی زندگی کا خیال رکھتا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا۔ اور کیوں مرنا نہیں چاہتا؟ اس لئے کہ زندگی میں امکانات کی کسی طرح بھی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ کیا سے کیا ہو سکتا ہے۔" یہ خیال ہمارے سامنے بے شمار امکانات کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس لئے جس طرح آپ چراغ کو ہوا سے بچاتے ہیں کہ اسے ہوا کا کوئی جھونکا بھی بجھا کر ختم کر سکتا ہے۔ گویا زندگی کی ناپائداری عام ہے لیکن ہم اپنی احتیاط سے اس عام ناپائداری کو طول دے کر خاص قسم کی ناپائداری بنا سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم اپنے ایک سانس پر بھی کوئی بھروسہ نہیں کر سکتے مگر یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ اگر ہم اپنی زندگی کا خیال نہیں رکھتے۔ تو اس کا کسی وقت بھی خاتمہ ہو سکتا ہے۔ زندگی کا خیال رکھنا ہمارے

اعتماد کو بحال کرتا ہے۔ اور زندگی کا خیال رکھنے کی بنیادی شرط' غور وفکر اور تحمل ہے۔ انیس شعر زیر بحث میں ہمیں اسی غور وفکر اور تحمل کی دعوت دے رہے ہیں۔ یقیناً ہر انسان کو اپنی زندگی کے بارے میں محتاط ہونا چاہئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا آدمی ہر وقت اپنی زندگی کے بارے میں محتاط رہ سکتا ہے۔ کیا اس کے لئے ہر حال میں محتاط رہنا ضروری ہے یا یہ ممکن ہے کہ آدمی ہر حال میں اپنی زندگی کا خیال رکھے۔ اس سوال کا جواب حیران کن انداز کی حد تک مثبت پہلو لئے ہوئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو ہر حال میں اپنی زندگی کے بارے میں محتاط ہونا ضروری ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس ضمن میں غیر محتاط نہیں ہو سکتا۔ احتیاط آدمی کو ڈرپوک یا بزدل نہیں بناتی۔ عام طور پر احتیاط کے ساتھ لوگ بزدلی کو چسپاں کر دیتے ہیں۔ حالانکہ محتاط آدمی کے لئے تو بزدلی کہیں دور دور بھی اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی۔ احتیاط تو آدمی کو زندگی کی قدر و منزلت سے آشنا کرتی ہے۔ محتاط ہو کر ہم اپنی زندگی کے امکانات کا جائزہ لیتے ہیں۔ میر انیس اپنے زیر بحث شعر میں یہی احساس دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ آدمی کو اپنی زندگی کے بارے میں ایک لمحے کے لئے بھی غیر محتاط نہیں ہونا چاہئے۔ جذبات کی معمولی سی اونچ نیچ انسان کو زندگی کے بارے میں غیر محتاط کر سکتی ہے اس لئے انیس کا مشورہ یہ ہے کہ زندگی کے ضمن میں جذبات کو کبھی اپنی حد سے آگے نہیں بڑھنے دینا چاہئے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ اپنے جذبات کا گلا گھونٹ ڈالیں۔ انیس جذبات کو ایک طاقت تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ طاقت اس قدر نزاکت عقل و خرد کی طالب ہے جس سے عہدہ برآ ہونا بہت چوکس رہنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ جذبۂ حفاظت سے یقیناً ہمیں کام لینے کی ضرورت ہے۔ لیکن وہی بات کہ یہ کام ہم لاابالی پن کے ساتھ سر انجام نہیں دے سکتے۔ البتہ یہ کام نازک اس لئے بھی بہت ہے کہ جذبۂ

حفاظت میں کبھی خشکی پیدا نہیں ہوسکتی۔ جذبۂ حفاظت تو ایک بہت ہی کیف آور جذبہ بن سکتا ہے۔ اگر ہمیں اس حقیقت کا پورا پورا احساس ہو جائے کہ جس چیز کی ہم حفاظت کر رہے ہیں۔ وہ کوئی معمولی چیز نہیں بے حد کیف آور چیز ہے۔

شعر زیر بحث میں چراغ اور ہوا کا ایسا پر لطف اور پر جمال استعارہ ہے جس سے احتیاط اور حفاظت کا کام خواہ مخواہ پر لطف اور پر جمال بن جاتا ہے۔ چراغ روشنی ہے اور ہوا اپنے انداز کی ایک تازگی ایک فعالیت جس میں پوری زندگی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ''دم کا بھروسا نہیں'' کی کیفیت اسی وقت دور ہوتی ہے جب ہمیں یہ پتا چلتا ہے کہ اگر ہم صبر و تحمل سے کام لیں تو دم کا بھروسا آدمی میں صد فیصد پیدا ہو جاتا ہے وہ سوچتا ہے کیسے بھروسا نہیں۔ دم کا بھروسا نہ ہوتو آدمی نے جو آج تک اتنے بڑے بڑے کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ وہ کیسے سرانجام دیئے جا سکتے تھے۔ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے اس سے یہی مراد ہے کہ اگر آپ صبر و تحمل سے کام نہ لیں تو زندگی پر سے اعتماد اٹھنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور شر کی اکثر صورتیں جلد بازی ہی سے وجود میں آتی ہیں۔ صبر و تحمل سے کام لیں تو زندگی پر اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ صبر و تحمل سے ہم پر زندگی کی ناپائیداری کے راز منکشف ہوتے ہیں۔ لیکن شعر زیر بحث تو روز مرہ زندگی کے حال احوال سے گزرتے وقت جس احتیاط کی ضرورت ہے ہمیں اس کے بارے میں آگاہ کر رہا ہے۔ واضح ہو کہ ہماری معمول کی زندگی غیر معمولی زندگی کے ساتھ بھی موجود ہوتی ہے ہم معمول کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ میں نے جو ابتداء میں یہ عرض کیا ہے کہ شعر زیر بحث

انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

کا تعلق میر انیس کے جملہ مراثی کے ساتھ ایک عجیب انداز میں قائم ہے وہ اس لئے کہ اس شعر سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میر انیس نے یہ شعر اپنی رثائی فضا کی بہت سی گرہیں کھولنے کے لئے کہا ہے۔ جب تک ہم شعوری یا لا شعوری طور پر اس شعر کے معنی ذہن میں نہیں رکھتے مراثیٔ انیس کی صحیح فضا میں داخل نہیں ہوتے۔ اس شعر کے معنی ہم سے پے در پے سوال کرتے ہیں کہ امام حسینؑ نے جو اپنے عزیز و اقربا کو دشت کربلا میں قربان کر دیا ان کی قربانی کیا معنی رکھتی ہے۔ اول تو امام حسینؑ مدینے ہی سے کیوں روانہ ہوئے تھے؟ اس لئے امامِ مظلوم کے زمانے میں بھی عام سوجھ بوجھ رکھنے والوں نے امام سے یہ سوال کر ڈالا تھا آخر آپ مدینہ چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں۔ امام عالی مقام نے یقیناً ان لوگوں کو سمجھایا ہو گا۔ اب یہ ضروری نہیں کہ امام مظلوم کی بات لوگوں کو سمجھ بھی آ گئی ہو۔ شعر زیر بحث کے ایک لفظ انیس کی جگہ بڑے اطمینان سے ہم حسین کا لفظ رکھ سکتے ہیں۔

حسین دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ کے لئے کہاں سامنے ہوا کے چلے

لیکن ایسا کرنے سے ہم اپنی نادانی کا ثبوت ہی فراہم کر سکتے ہیں۔ کیونکہ پروردۂ رسولؐ سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ بغیر سوچے سمجھے حسین نے مدینہ سے ہجرت گوارا کی ہو گی۔ حسینؑ کا مدینہ چھوڑنا اس شعر کی عام صورتِ حال کو یکایک نئی صورت حال کے حوالے کر دیتا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ حسین کو اپنی زندگی کی حفاظت کا خیال نہ ہو گا۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ جب حسینؑ مدینے سے رخصت ہو رہے تھے اس وقت انہیں اپنی زندگی پر اپنی بھی کیا اپنے تمام ساتھ والوں کی زندگی پر بھی پورا پورا بھروسا تھا۔

انہیں یقین تھا کہ وہ اور ان کے ساتھی منزل مقصود تک پہنچنے سے پہلے کسی طرح بھی اپنی زندگیوں سے ہاتھ نہیں دھو سکتے یا ان کی زندگیوں پر آنچ آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ معمول کی زندگی انسان کی غیر معمولی زندگی کے ساتھ وابستہ رہتی ہے۔ لہٰذا ہر لحہ امام حسین اور ان کے رفقاء اپنی اپنی زندگی کی حفاظت کا خیال تو پوری طرح رکھ رہے ہونگے۔ یہ الگ بحث ہے کہ ان کی حفاظت کا انداز قطعی طور پر مختلف ہوگا۔

چراغ کے استعارہ کی مختلف صورتیں:

شعر زیر بحث میں زندگی کے لئے جو چراغ کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔ اور حادثات کے لئے ہوا کا استعارہ استعمال ہوا ہے اسے ذہن میں رکھیے اب میر انیس کے ایک مشہور مرثیہ کو سامنے رکھ کر اس استعارۂ چراغ اور استعارہ ہوا کی وہ مختلف صورتیں ملاحظہ فرمایئے جن سے ان پر دو استعارات یعنی چراغ اور ہوا کی وسعتوں کا پتا چل رہا ہے دیکھئے یہ ہر دو استعارے کس طرح انسانی زندگی کو ان حالات میں بیان کرتے ہیں جب انسان کے سامنے کوئی بہت عظیم مقصد ہوتا ہے خصوصیت سے چراغ کے استعارے کو میر انیس کے اس معروف مرثیہ کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔ اس میں چراغ کے حوالے سے بات ہو رہی ہے۔

بخدا فارسِ میدان تہور تھا حُر ایک دو لاکھ سواروں میں بہادر تھا حُر
نار دوزخ سے ابوذر کی طرح حُر تھا حُر گوہر تاج سر عرش ہو وہ دُر تھا حُر
ڈھونڈلی راہ خدا کام بھی کیا نیک ہوا
پاک طینت تھی تو انجام بھی کیا نیک ہوا

آپ جانتے ہیں حُر پہلے فوج یزید میں سالار تھا اسی نے کربلا آتے ہوئے امام حسین کے قافلے کو روکا تھا اور اسی حُر کے پیاسے قافلے کو امام حسین نے

اپنے پاس سے پانی پلوایا تھا۔ اور کربلا میں جب ماہ محرم کی شب عاشور آئی تو حُر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ فوج یزید کو چھوڑ کر امام حسین کی طرف آ گیا۔ اور یوں اس کی تمام زندگی کا رخ بدل کر رہ گیا۔ اب آپ مرثیہ کے پہلے بند پر جو اوپر درج کیا گیا ہے غور فرمایئے۔ اور شعر زیر بحث انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ۔ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے کو بھی ذہن میں رکھیے تو آغاز مرثیہ کے پہلے مصرع ہی میں آپ محسوس کریں گے جیسے حُر کی تمام ذات اس کا پورا پیکر جسمانی امام حسین کے لشکر میں آتے ہی زندگی کے چراغ سے قلب ماہیت ہو کر مردانگی کے میدان کا ایک آزاد شہسوار بن گیا ہے۔ "تہور تھا حُر" یہاں قافیہ تہور اور ردیف حُر کے پیش کی آواز سے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے چراغ کبھی میدان تہور میں اپنی روشنی دکھا رہا ہے اور کبھی یہی چراغ حُر کی ذات کو بقعۂ نور بنا رہا ہے۔ اور دوسرے مصرع سے پتا چل رہا ہے یہی حُر کی زندگی کا چراغ کس طرح ایک دو لاکھ سواروں میں بہادر یعنی قیمتی موتی کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن حُر کی ذات کی روشنی میں کہیں دور دور بھی دوزخ کی آگ موجود نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو اس آگ سے معروف صحابیٔ رسولؐ ابوذر کی طرح آزاد ہو گیا ہے۔ اور حُر کے چراغ زندگی نے امام حسینؑ کی طرف آ کر اپنی تابانی میں اتنی بلندی حاصل کر لی تھی کہ وہ عرش کے سر کے تاج کا موتی بن گیا۔

اس مرثیے کا دوسرا بند اس مصرع سے شروع ہوتا ہے۔

واہ رے طالع بیدار زہے عزت و جاہ

یعنی حُر کے اس چراغ زندگی نے طالع بیدار کی صورت اختیار کر لی یعنی جاگتا ہوا ستارہ یا ماہ نو بن کر سامنے آیا جو یقیناً اس کی عزت و شان و شوکت کا سبب ثابت ہوا۔ اور اب اسی مرثیے کا تیسرا بند ملاحظہ فرمایئے۔ یہاں بھی حُر کا

چراغ زندگی اسے نار سے نور کی طرف لا رہا ہے۔

نار سے نور کی جانب اسے لائی تقدیر   ابھی ذرّہ تھا ابھی ہو گیا خورشید منیر

حُر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ امام حسینؑ کی طرف آنا ان کی حمایت کرنا بظاہر اپنی جان کو کھو دینے کے برابر ہے لیکن دیکھ لیجئے یہاں انیس کا زیر بحث شعر کس طرح عجب انداز کے معنی سے دوچار ہو رہا ہے۔ کیا کوئی سوائے بے خبر لوگوں کے جیسا کہ یزید کی فوج میں تھے کوئی حُر کو کہہ سکتا تھا کہ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے۔ خود حُر کو معلوم تھا اس وقت جان کی حفاظت کرنا جان کو تباہ و برباد کرنے کے مترادف ہے۔ اس وقت تو چراغ جاں کو ظلم و ستم کی چلتی ہوا کے حوالے کرنا زیادہ درست معلوم ہو رہا ہے۔ اس وقت یہ کہنا کہ دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ بالکل بے معنی اور لغو معلوم ہوتا ہے۔

حُر حضرت امام حسین کی طرف سے فوج یزید کی طرف لڑنے کے لئے آ رہا ہے اب آپ حُر کی زندگی کے چراغ کو کیا کہیں گے۔

رن میں جب شر کی طرف سے حُر دیں دار آیا   کس بشاشت سے اڑاتا ہوا رہوار آیا

غل ہوا سید مظلوم کا غم خوار آیا   جان نثارِ خلفِ حیدر کرار آیا

طبق نور سرِ راہ نظر آتا ہے

جلوۂ قدرتِ اللہ نظر آتا ہے

آپ نے ملاحظہ فرمایا حُر کی زندگی کا چراغ طبقِ نور بن گیا ہے۔ اور اس میں اللہ کی قدرت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ پھر امام حسینؑ کے قدموں کا یہ اثر ہے۔ خود فوج یزید کے لشکری کہہ رہے ہیں۔

تن ہے خوشبو رُخ گل رنگ تر و تازہ ہے

خاکِ نعلین مبارک کا عجب غازہ ہے

حضرت حُر جواب دیتے ہیں۔

حُر پکارا کہ بجا کہتے ہو لاشک لاریب
دامن حضرت شبیر نے ڈھانپے مرے عیب

اور مزید حُر فرما رہے ہیں۔

مجھ کو خورشید کیا نور خدا کی ضو نے   نور بخشا پسرِ فاطمہ کے پرتو نے
بخت پائے ہیں سکندر کے غلام نو نے   گنج وہ لایا ہوں دیکھا جو نہ تھا خسرو نے

دور دور آج سے میرا ہے زمانہ میرا
کبھی خالی نہیں ہوئے گا خزانہ میرا

فوج یزید کے لشکری کہہ رہے ہیں ہم تو امام حسین کو ختم کرنے والے ہیں۔ اس پر حُر انہیں سمجھا رہے ہیں۔ امام حسینؑ کی ذات کے بارے میں حُر کہتے ہیں۔

جانِ سلطانِ رسالت کو غنیمت جانو   پسرِ شاہ ولایت کو غنیمت جانو
نور خالق کی زیارت کو غنیمت جانو   نیّر بُرج امامت کو غنیمت جانو

ساتھ اس کے برکت خلق سے اٹھ جائے گی
پھر جو ڈھونڈو گے یہ دولت تو نہ ہاتھ آئے گی

اس سے اگلے بند میں حُر فوج یزید کو سمجھا رہے ہیں لیکن چراغ کا استعارہ کس وسعت اور خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے۔ یعنی امام حسین کی زندگی کو چراغ اسلام کہا ہے۔

ایک سیّد کو مٹا دینے میں ہے کونسا نام
اس ہوا پر ہو کہ بجھ جائے چراغ اسلام

اس کے بعد حُر نے خوب جنگ لڑی لیکن آخر کار یعنی ہمارے اس چراغ

کو ہوا نے اس طرح بجھا دیا۔

سینہ غربال ہوا تیر چلے اعدا کے

گویا ہوا کے استعارے نے تیروں کی شکل اختیار کر لی۔ جب حُر بری طرح زخمی ہو کر گر پڑے تو پہلے حضرت علی اکبر نے کہا میں حُر کی لاش اٹھا کر لاتا ہوں پھر عباس علمدار نے یہی فرمایا لیکن امام حسین نے ارشاد کیا۔

ایسا ذی رتبہ کوئی خلق میں کم نکلے گا
میرے مہماں کا مری گود میں دم نکلے گا

ایک دوسرے مرثیے میں اب ذرا آپ یہ بھی دیکھ لیجئے کہ امام حسینؑ کی بہن اور فاطمۃ الزہراؑ کی لاڈلی اور علی بن ابی طالبؑ کی بیٹی ہمارے رسولؐ پاک کی نواسی زینبؑ مقتل کربلا میں کس طرح اپنے دونوں بیٹوں کو رخصت کر رہی ہیں۔ اور پھر شعر زیر بحث کو یاد کیجئے انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ۔ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے۔ امام حسین نے حضرت زینبؑ کے دونوں بیٹوں عون و محمد کو جنگ کی اجازت دے دی ہے۔ دونوں خیمے سے باہر نکل رہے ہیں ۔ ساتھ ساتھ جناب زینبؑ اس صورت میں تھیں۔

کیا دل تھا نہ روتی تھی نہ گھبراتی تھی زینبؑ
سمجھاتی ہوئی ساتھ چلی جاتی تھی زینبؑ

پھر جناب زینبؑ فرماتی ہیں۔

دو روز کے پیاسو تمیں اللہ کو سونپا
حیدر کے نواسو تمہیں اللہ کو سونپا

اس مرثیہ کا اگلا بند ہے۔

ماں صدقے بزرگوں کے چلن بھول نہ جانا   سیکھے ہو جو کچھ جنگ کے فن بھول نہ جانا
آداب شہنشاہ زمن بھول نہ جانا   جو میں نے کہا ہے وہ سخن بھول نہ جانا

وہ کہتے تھے جرأت تو خدا داد ہے اماں
تشویش نہ کیجئے ہمیں سب یاد ہے اماں

میں جو بات ابتداء سے واضح کرنا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ شعر زیر بحث کے تحت زندگی کا خیال رکھنا عام حالات میں اپنی جگہ ایک اہم فریضہ ہے لیکن زندگی کا خیال خاص حالات میں کیا کیا صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یہ میر انیس کے مراثی کا سب سے اہم موضوع ہے اور اسی نکتے کے تحت میں یہ ابتداء ہی سے عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ میر انیس کا زیر بحث شعر ایک طرف اور میر انیس کے جملہ مراثی دوسری طرف اپنے موضوع کے ساتھ دست و گریباں ہیں دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح اپنے موضوع کو سنبھالے ہوئے ہیں یعنی میر انیس کا یہ شعر زیر بحث میر انیس کے جملہ مراثی کو ایک عجیب بلاغت کے ساتھ اپنے احاطۂ اثر میں لئے ہوئے ہے۔ اور یہی وہ میر انیس کی شاعرانہ بصیرت ہے جس کو میں واضح کرنے کی کوشش کررہا ہوں کہ مراثی میں میر انیس کے بیانیہ کے جوہر کھلتے ہیں تو ان کے سلام کے اشعار میں ان کی اختصار گوئی کی وضاحت ہوتی ہے۔

جس مرثیے سے جناب زینبؑ کے دو بیٹوں عون و محمد کی رخصت کا حوالہ میں پہلے دے چکا ہوں اسی مرثیے کے بند ملاحظہ کیجئے۔ جب میدان جنگ میں بہادری سے لڑنے کی خبر جناب زینب تک پہنچی کہ ان کے بیٹے خوب جنگ کررہے ہیں تو دیکھئے یہ ماں اپنے بیٹوں کے بارے میں کیا فرمارہی ہیں۔

کہا زینب نے کہ بیٹے مرے کرتے ہیں وغا   ارے لوگو کرو سر کھول کے خالق سے دعا
ابھی معصوم ہیں بچے ہیں ذرا سے ہیں وہ   بھوکے دو دن کے ہیں دو روز کے پیاسے ہیں وہ

مزید فرماتی ہیں۔

کبھی کا ہے کو لڑے ہیں وہ مرے ماہ منیر   نہیں دیکھی ہے چمکتے کبھی برقِ شمشیر
کہاں دو طفلِ صغیر اور کہاں فوجِ کثیر   یہی دھڑکا ہے کہ ہو جائیں نہ اعدا میں اسیر
یہ دعا مانگو کہ سر ان کے اتارے جائیں
میرے بھائی کی بلا لے کے وہ مارے جائیں

اب آپ ملاحظہ فرمایئے کہاں زندگی کی حفاظت کے لئے شعر زیر بحث میں کہا جا رہا ہے چراغ لے کے ہوا کے سامنے نہ جاؤ کہاں ماں اپنے بیٹوں کے لئے لوگوں سے دعا منگوا رہی ہے کہ اسکے بیٹے اس کے بھائی پر قربان ہو جائیں۔ اس سے اگلا بند بھی ملاحظہ کریجئے۔

کہہ کے یہ فاطمہ کی بیٹی نے عریاں کیا سر   خاک پر رکھ کے جبیں حق سے کہا رو رو کر
بہر زہرا و علی بہر حسین و شبر   ہو مرے بیٹوں کا انجام بخیر اے داور
سرخ رو عون ہو سر سبز محمد ہووے
صدقہ دیتی ہوں کہ بھائی کی بلا رد ہووے

اب میدان جنگ کی طرف بھی آیئے

یاں تو سر کھولے ہوئے کرتی تھی زینب یہ دعا   دونوں لڑکوں پہ وہاں شام کا بادل امڈا
سینکڑوں تیغیں کھینچیں تبروں کا مینہ پڑنے لگا   نیمچے کھینچ کے بھائی نے یہ بھائی سے کہا
لاکھ آفت اگر افلاک سے ٹوٹے بھائی
روح و قالب کی طرح ساتھ نہ چھوٹے بھائی

آپ نے ملاحظہ فرمایا زندگی کی حفاظت کے خیال کی ایک یہ بھی صورت ہے۔ دونوں بھائی جب تک لڑ سکتے ہیں۔ جب تک زندہ ہیں مل کر لڑیں اور آخیر وقت تک مضبوطی کے ساتھ زندہ رہیں۔ دونوں بچوں نے خوب جنگ کی اور دریا

کے کنارے تک پہنچ گئے۔

چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے اس وقت کہا　بھائی دیکھو تو کہ لہراتا ہے کیسا دریا
ماموں کے واسطے لے چلتے جو پانی ملتا　نہر میں چل کے بس اب ڈال دو گھوڑے بھیا

تم ہو پیاسے شہ عالم بھی بہت پیاسے ہیں
اماں بھی پیاسی ہیں اور ہم بھی بہت پیاسے ہیں

آپ جانتے ہیں زندگی کے لئے پانی کتنا ضروری ہے۔ لیکن چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی میں دریا تک جانے پانی سے منہ دھونے وغیرہ۔ کے بارے میں مکالمہ ہوتا ہے اور آخر میں فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پانی نہیں پئیں گے۔اب مرثیہ کے بند ملاحظہ فرمایئے۔

پانی پینے کا تو ممکن نہیں دھیان آجاوے
ہاتھ منہ دھولیں ذرا چل کے تو جان آجاوے

اس پر بڑا بھائی سمجھا رہا ہے۔

ہاتھ منہ دھویا اگر نہر پہ جا کر تو کیا　ہاتھ اب جان سے دھونا ہے مناسب بھیا
جائیں دریا پہ تو ہم چشموں میں ہوگا چرچا　رہ سکے پیاسے نہ سبطین علی اعلیٰ

گل زہرا تو ہوا خشک وہ شاداب ہوئے
ماموں پیاسا رہا اور بھانجے سیراب ہوئے

اس پر چھوٹا بھائی جواب دیتا ہے۔

کہا گھبرا کے محمد نے کہ اے نیک صفات　ماموں کے پانی پلانے کو کہی تھی یہ بات
ورنہ جب تک نہ پئیں شاہ رفیع الدرجات　خاک سمجھیں ہمیں ہاتھ آئے اگر آبِ حیات

آبرو دیں گے نہ گو بھوکے پیاسے ہیں ہم
حضرت ساقی کوثر کے نواسے ہیں ہم

بھائی سے کر رہا تھا یہ ابھی باتیں بھائی   چار جانب سے جو پھر فوج سمٹ کر آئی

اس کے بعد سب ظالم لشکریوں نے بچوں کو شہید کر دیا۔ اور جب امام حسین دونوں کے لاشے خیموں میں لائے تو جناب زینب کی حالت ملاحظہ فرمایئے۔

دیکھ کے لاشوں کو یہ بیبیوں سے کی گفتار   بھائی کے فدیہ جو ہیں ان پہ مجھے آتا ہے پیار

وہی دونوں نے کیا کر گئے تھے جو اقرار   میرے فرزندوں کے لاشوں پہ کرو مجھ کو نثار

حق نے کیا مرتبہ ان دونوں کو امداد کیا

دودھ تو بخشوں کہ بیٹوں نے مجھے شاد کیا

یہ تو میں نے مراثی انیس کے صرف دو مرثیوں میں سے مثالیں پیش کی ہیں۔ وہی بات کہ آپ میر انیس کے تمام مراثی کو پڑھ جائیں آپ کو ان میں خوشی خوشی جان کے نذرانے پیش کرنے کی عام فضا نظر آئے گی۔ اور ہمیں پتا چلے گا کہ ہمیں کہاں اپنی جانوں کی حفاظت کرنی چاہئے اور کہاں جان کو قربان کر دینا اپنے آپ کو زندۂ جاوید بنانے کے مترادف ہو جاتا ہے اور کس طرح میر انیس کا یہ زیر بحث شعر ہمیں یہ نکتہ بار بار سمجھاتا نظر آتا ہے کہ زندگی کی حفاظت اصل میں ایسے عظیم مواقع کے لئے ہی کی جاتی ہے۔

انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ کا مطلب یہ ہے کہ اس زندگی کو عام روٹین کی زندگی میں نہ گزارو اس زندگی کے لئے عمدہ مواقع کی تلاش کرو اور اس تلاش کے لئے اس پر غور کرنے کے لئے بعض وقت معمولی سا ایک لمحہ بھی بہت ہوتا ہے۔ عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اپنی جان کو کسی بہت ہی غیر اہم سی بات کے لئے جوکھم میں ڈال دیتے ہیں۔ جو کسی طرح بھی کوئی عمدہ بات نہیں ہے۔

اصل میں میر انیس کا یہ شعر زیر بحث ہمیں اس غفلت سے نکالنے کی طرف ایک بہت ہی خوبصورت اور چمکدار اشارہ کرتا ہے ۔ چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے۔ مطلب یہ ہے کہ چراغ کو ضرور لے کر چلو لیکن یہ دیکھ لو کہ چراغ کو لے کے جا کہاں رہے ہو۔ موقع و محل کا تعین اس شعر کی جان ہے اور اس شعر میں جتنے مطالب و معانی پیدا ہوتے ہیں وہ اس تعین کے طفیل نمو پاتے ہیں۔ گویا میر انیس کا شعر ان عظیم مواقع کی طرف مسلسل اشارہ کئے جا رہا ہے۔ جن عظیم مواقع کو مراثی انیس ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔

مراثیٔ انیس میں انسانی بے قراری کی تاریخ

(میر انیس کے ایک شعر کے حوالے سے ایک فکر انگیز تجزیہ)

ہم اور آپ عموماً یہی سمجھتے ہیں کہ بے قرار ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ بے قرار آدمی چونکہ ایک جگہ ٹھہرتا نہیں اس لئے وہ دنیا میں کوئی کام ٹک کر اور جم کر نہیں کر سکتا ۔ زندگی تو دراصل نام ہی جم کر کچھ کر گذرنے کا ہے۔ لیکن میر انیس نے اپنے ایک شعر میں بڑی دلیل کے ساتھ بے قراری کو ایک نہایت عمدہ قدر کے طور پر پیش کیا ہے۔ جی ہاں ایسی عمدہ قدر جو دوسری تمام انسانی اقدار کو ایک طرف رکھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ سوچنے کی بات ہے جملہ انسانی اقدار کا مقصد کیا ہے؟ یہی نا کہ ایک عزت و سلامتی سے بھرپور زندگی گزارنے کے مواقع بہم پہنچ جائیں۔ اور پھر یہ عزت و سلامتی کی زندگی کوئی ایک یا دو دن کی نہ ہو بلکہ اس کو دوام حاصل ہو۔ مزید کچھ عرض کرنے سے قبل میں چاہوں گا کہ آپ کو انیس کا وہ شعر سنا دوں جس پر کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں ہاں تو میر انیس کے ایک سلام کا شعر ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

جہنم سے ہم بے قراروں کو کیا
جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں

آپ جانتے ہیں جہنم اس جائے قرار' اس ٹھکانے کو کہتے ہیں جو گناہ گاروں کے لئے وقف ہے۔ اس جائے قرار میں عذاب یعنی تکلیف ہو گی اور یہ آگ سے بھرا ہوا ہو گا۔ جہنم کی اس تعریف کو پیش نظر رکھتے ہوئے انیس فرماتے ہیں۔ کہ اس عذاب والے اور آگ والے ٹھکانے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اور ہمارا کوئی تعلق بن بھی نہیں سکتا۔ کہ ہم تو بنیادی طور پر بے قرار لوگ ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بے قرار لوگ کون ہوتے ہیں اور بے قرار بھی مثبت معنی میں کہ جن کا جہنم سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ کیونکہ ان کی بے قراری بنیادی طور پر ایسی ہے کہ جو انہیں آگ پر ٹھہرنے ہی نہیں دیتی بالکل اسی طرح جس طرح کے پارے کی فطرت ہی میں ہے کہ وہ آگ پر نہیں ٹھہرتا۔ حالانکہ وہ ہوتا بے قرار ہے مگر اس کی بے قراری میں ایک حسن ایک حرکت ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ زندگی تو نام ہی حرکت کرنے کا ہے۔ کم از کم زندگی بے حرکت نہیں ہو سکتی۔ میر انیس نے انسانی زندگی کو یا انسانوں کو پارے کے ساتھ تشبیہ دے کر اپنی ایک بہت ہی عمدہ اور معنی خیز شاعرانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ پارہ دیکھنے میں خوش نما بھی ہوتا ہے۔ اور اس کا ارتعاش یا بے قراری بھی قابل دید ہوتی ہے۔ کہ پارہ اپنی بے قراری کے عالم میں یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنے آپ کو کسی عمل کے لئے تیار کر رہا ہے۔ اپنے آپ کو وارم اپ اور اس کی یہ سرگرم عمل وارم اپ ہونے کی کیفیت اس کی زندگی کا بھی ایک جیتا جاگتا ثبوت ہوتی ہے۔ اس طرح جو بے قرار قسم کی طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں وہ اپنی بے قراری سے ہمہ وقت اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ ان کی بے قراری کی اس کیفیت سے یہ پتا بھی چلتا ہے کہ یہ لوگ اپنے فرائض سے بھی غافل نہیں ہوتے۔ ان کی بے قراری انہیں کچھ کر گذرنے کی یاد ہر وقت دلاتی رہتی ہے۔ گویا بے قرار قسم کے لوگوں کے سامنے ان

کی زندگی کا نصب العین ہمہ وقت حاضر رہتا ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ یہ لوگ اپنے نصب العین کی وجہ سے ہمہ وقت جگمگاتے اور روشنی پھیلاتے رہتے ہیں۔

شعر زیر بحث میں لفظ جہنم نے شعر کو عقیدہ سے بھی وابستہ کر دیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بے قرار لوگوں کی بے قراری کوئی معمولی یا عام قسم کی بے قراری نہیں ہے اس بے قراری کا ایک مقصد ہے جس کے ڈانڈے دوام سے ملتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ابد تک بے قرار رہنے والے ہیں جب ان کے نصب العین کی کوئی انتہا نہیں ہے تو ان کی بے قراری کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ جہنم کی تو پھر بھی کوئی انتہا ہے۔ کہ آدمی وہاں جا کر ٹھہر جاتا ہے لیکن وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔ جیسا کہ سورہ ابراہیم کی آیت ۲۹ میں اشارہ ہوا ہے۔ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ۔ ناشکرے لوگوں کے بارے میں اس سے اوپر والی آیت ۲۸ میں ذکر ہو رہا ہے۔ کہ ایسے لوگ پوری قوم کو تباہی کے گھر میں اتار دیتے ہیں۔ اور وہ تباہی کا گھر کیا ہے۔ جہنم جس میں یہ (سب ناشکرے) داخل ہونگے اور (یہ جہنم) بہت برا ٹھکانہ ہے۔ اس آیت مبارک کے مطابق قرار ٹھکانے کو کہتے ہیں۔ اور جہنم اسلئے برا ٹھکانہ ہے کہ ایک تو وہاں تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے لوگ جو اس میں داخل ہوتے ہیں انہیں مسلسل جلاتی رہتی ہے۔ اور اس طرح ان کے قدم آگے نہیں بڑھتے۔ وہ قرار کی کیفیت میں ہوتے ہیں۔ اور یہ کیفیت قرار قطعی طور پر کوئی عمدہ چیز نہیں ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں بے قرار لوگ آگے ہی آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اسی لئے میر انیس بڑے وثوق کے ساتھ کہہ رہے ہیں۔

جہنم سے ہم بے قراروں کو کیا

بے قراری میں دوسری اعلیٰ انسانی قدریں کس طرح سموئی ہوئی ہیں۔ یہ

ایک بہت واضح سی بات ہے بس ذرا توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ایثار اور قربانی ایک بہت اعلیٰ انسانی قدر ہے۔ ایثار کرنے والے افراد اس لئے ہمیشہ بے قرار رہتے ہیں کہ وہ ایثار قربانی کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ہوشیار رہتے ہیں۔ کہ کہیں کوئی موقع ان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوجائے۔ اس طرح شجاعت دکھانے کا موقع آئے اور کب شجاعت دکھائی جائے۔ بہادر آدمی بھی کبھی چین سے نہیں بیٹھتا کہ اسے ہر لحہ یہ اندیشہ رہتا ہے کہ بہادری دکھانے کا موقع ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ جملہ اخلاقی قدروں کا مرتبہ بے قراری اس لئے قرار پاتی ہے کہ بے قرار لوگ اپنے ملنے والوں سے ایک لحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہوتے۔ ایک دوسرے کے کام آنا' حوصلہ بڑھانا' ایک دوسرے کی عزت وحرمت کا خیال رکھنا' ایک دوسرے کے دکھ درد میں خوشی میں شریک ہونا ان سب کاموں کے لئے آدمی کا بے قرار رہنا ایک لازمی امر ہے۔ بے قراری گویا آدمی کو صحیح معنی میں زندہ رکھتی ہے۔ اور سب سے بڑی بات میر انیس کے اس زیر بحث شعر کے مطابق یہ ہے کہ بے قرار لوگوں کا انجام ہمیشہ بخیر ہوگا۔ ان کے لئے جہنم جیسے ٹھکانے کا ہم دور دور تک بھی تصور نہیں کر سکتے۔ بے قرار لوگ تو بس ایک بات جانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی بھلائی کے لئے اپنی بے قراری کو قائم و دائم رکھیں۔ اور یوں انسانیت اپنے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے میں مسلسل کامیاب و کامران ہوتی رہے۔ دراصل بے قراروں کی بے قراری کا عالم باد بہار کے باعث نو نہالوں کے ہر دم جھومنے اور تازہ دم رہنے کے عالم سے مشابہ سمجھئے کہ بقول انیس بے قرار لوگوں کو جہنم سے تو کوئی سروکار ہی نہیں۔ ان کی قسم [illegible] میں تو ہر دم تازم دم اور سرسبز وشاداب رہنا ہے۔

جہنم سے ہم بے قرار کو کیا
جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں

اور اس شعر زیر بحث کے ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ جب بے قراروں کا جہنم سے کوئی واسطہ نہیں تو پھر یقیناً اس کا واسطہ جنت سے مسلم ہے۔ اور جنت سے رابطہ اور ضابطہ اس بات کو بخوبی واضح کرتا ہے کہ جنت کی ضامن ان کی یہ بے قراری ہے۔ اور یہی بے قراری ان کی جنت کو بھی طرح طرح کے معنی عطا کرتی رہے گی۔ کہ یہ بے قرار لوگ وہاں بھی کاہل اور سست ہو کر کہاں بیٹھیں گے۔ مسلسل آگے بڑھنا مسلسل اپنے آپ کو حرکت میں رکھنا گویا ان کی فطرت بن چکی ہو گی۔ اور جنت ان کی اس بے قراری کو کم نہیں کرے گی بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں جا کر یہ بے قرار لوگ اس شان اور آن بان سے بے قرار ہونگے کہ جنت کو اپنا دامن وسیع کرنا پڑے گا۔ اور یہ سب فیض اسوۂ رسولؐ کو نگاہوں کے سامنے رکھنے کا ہو گا۔ کہ یہ اسوۂ رسولؐ کوئی خواب بھی نہیں ہے کیونکہ اس پر عمل پیرا ہو کر آل رسولؐ اور اصحابِ پاک رسولؐ نے بخوبی دکھایا ہے اور اس کی گواہ تاریخ ہے یہ دوسری بات ہے کہ ہم اپنی تاریخ ہی کو مطالعہ کرنے سے خواہ مخواہ گریزاں رہیں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو زندگی کی بہت سے سعادتوں سے محروم کرتے چلے جائیں۔

لیکن اس بے قراری کی تاریخ کو اسوۂ حسنہ رسولؐ کے حوالے سے جس طرح آلِ رسولؐ نے مرتب کیا اور امام حسینؑ نے واضح طور پر اس کو میدانِ کربلا میں عمل میں لاکر دکھایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میر انیس نے اپنے مراثی میں اسی بے مثال تاریخ کو بیان فرمایا ہے۔ آپ اس بے مثال تاریخ کے نمونے مراثیٔ انیس میں جہاں سے جی چاہے ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

لیکن مراثیٔ انیس میں انسان کی اس بے قراری کی تاریخ کو مطالعہ کرنے سے قبل اپنے ذہن میں اوّل اسوۂ حسنہ رسول کو رکھنا ہوگا۔ اور اس ضمن میں اسوۂ حسنہ کو ذہن میں رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ اچھی طرح یہ جان رہے ہونگے۔ یا آپ کے ذہن میں یہ حقیقت اور اس حقیقت کی تاریخ موجود ہوگی کہ کس طرح آنحضرتؐ نے انسان کی بے قراری کو اپنے کردار میں اور اپنی ذات میں جذب کیا۔ اور اس بے قراری کو اعلیٰ انسانی اقدار میں بدل کر دکھایا۔ یہی بے قراری صبر وتحمل کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ کبھی یہی بے قراری تدبر اور غور و فکر کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ کبھی یہی بے قراری شجاعت ایثار اور جوانمردی کے طور پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ لیکن یہی بے قراری انسان سے محبت کے درجے کو بھی اس قدر بلند کر دیتی ہے کہ دشمن کے لئے بھی خیر و عافیت کی دعا مانگی جا رہی ہے۔ دشمن کو بھی تکلیف اور کرب میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ لیکن سب سے بڑی بات دیکھنے کی یہ ہے کہ آنحضرت نے اپنے اسوۂ حسنہ کو اپنے تک محدود نہیں رکھا۔ سب سے پہلے حضرت علیؑ کی تعلیم و تربیت اور پرورش فرمائی ۔ پھر جناب فاطمہ الزہرا کی کہ وہ تو ان کی بیٹی تھیں اس کے بعد حسنؑ و حسینؑ کی کہ وہ ان کے نواسے تھے اور پھر اصحاب پاکؓ پر جس قدر توجہ فرما سکتے تھے اس میں کوئی فروگذاشت نہیں کی۔ گویا آنحضرتؐ کی آل میں اسوۂ حسنہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے کہ آل کو آنحضرتؐ سے فیض حاصل کرنے کا موقع اور وقت زیادہ ملا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے ہر ذی شعور مسلمان اور انسان تسلیم کرنے سے کبھی گریز نہیں کرسکتا۔ اور اسے ایسا کرنا بھی نہیں چاہئے۔ اگرچہ مسلم امہ میں کچھ ایسے افراد بھی موجود ہیں جو تاریخ اسلام کو فراخدلی کے ساتھ مطالعہ کرنے سے عموماً گریز کرتے ہیں۔ بہرحال جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے مراثیٔ انیس میں آپ اس انسانی بے

قراری کی تاریخ کا بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اور اس کے لئے میر انیس کے چند خاص مراثی کی قید نہیں۔ آپ جس مرثیے کو بھی بغور دیکھیں گے ۔ آپ کو اس میں اس تاریخ کے گونا گوں پہلو نظر آئیں گے۔

اصل میں ایک سچے اور کھرے انسان کے دل کی بے قراری اس زندگی میں کچھ کر گزرنے کی فعال بے قراری ہوتی ہے جس میں خیر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ ایک سچا اور کھرا انسان ہر لمحے کچھ نہ کچھ اچھی بات کہنا بھی چاہتا ہے اور کرنا بھی چاہتا ہے۔ اس طرح ایک سچے کھرے انسان کا دل قول وفعل کے پیہم چراغاں کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ اور ایک سچے اور کھرے انسان کو ہر سن وسال میں دیکھنے کی خواہش اگر کہیں پوری ہوسکتی ہے تو وہ میدان کربلا ہے میدان کربلا میں یہ سچے کھرے انسان بہت تھوڑے تھے لیکن چونکہ ہر ایک اپنی جگہ بھاری اور مضبوط تھا اس لئے دشمن کی بزدل فوج کے سامنے یہ کم تعداد لوگ بہت نظر آتے تھے۔ انیس کے مراثی انہیں سچے اور کھرے لوگوں کے اقوال اور کارناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس لئے آپ اگر ان مراثی سے مثالیں لینا چاہیں تو آپ کے لئے مثالوں کا انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ بس آپ کا دل یہی چاہتا رہتا ہے۔ کہ یہ مثال بھی دی جائے یہ بھی دی جائے آپ ان مثالوں میں سے کسی کو بھی نظر انداز کرنے کی ہمت اپنے آپ میں نہیں پاتے۔ اسی لئے میں نے مراثیٔ انیس میں سے بہت کم مثالیں دیں ہیں۔ اور قارئین کو یہی مشورہ دیا ہے کہ وہ از خود مراثیٔ انیس کا مطالعہ کریں تاکہ وہ بھرپور انداز کے شاعر انیس سے صحیح معنی میں متعارف ہوسکیں۔

حضرت امام حسینؑ تو خیر کربلا کے ان بے قراروں کے قافلہ سالار تھے۔ ان میں سے آپ کوئی بھی کردار لے لیجئے اپنی بے قراری کی بے شمار مثالوں میں

سے آپ کو حیران کر ڈالے گا۔ آلِ رسول کی بے قراری کا تو ذکر ہی کیا ذرا آپ کربلا کے عام رفقائے حسینی کو بھی سامنے رکھیں گے تو ایک نئی دنیا نظر آئے گی۔ میں نے اس خیال سے حسب عادت میر انیس کے مراثی کی ایک جلد ہاتھ میں لی اور اسے کھولا تو میرے سامنے یہ مرثیہ آیا۔

کیا فوج حسینی کے جوانانِ حسین تھے

یہ مرثیہ حضرت حبیب ابن مظاہر سے متعلق ہے جو امام حسین کے دیرینہ دوست تھے۔ اور بہت ضعیف العمر بھی' میں نے سوچا کیوں نہ اس مرثیے سے رفقائے حسینی کی بے قراری کے مختلف انداز مطالعہ کئے جائیں۔ آغاز مرثیہ میں تو اُن کے ظاہری حسن و جمال کا ذکر ہے۔ اور لفظ ''کیا'' سے پتا چلتا ہے کہ آپ جس قدر بھی ان کے حسن و جمال ظاہری کے بارے میں تصور کر سکتے ہیں۔ تصور کر لیجئے۔ آپ حق بجانب رہیں گے وہ اس لئے کہ انسان کے ظاہری حسن کو جو چیز پائداری عطا کرتی ہے۔ اور اس میں واقعی جو چیز جاذبیت پیدا کرتی ہے وہ اس کا کردار اور تقویٰ ہے۔ اسی لئے میر انیس نے دوسرے مصرع میں بات کی وضاحت کر دی۔ کیا زاہد و ابرار تھے کیا صاحب دیں تھے۔ یعنی ان رفقائے حسینی کے زہد و تقویٰ اور نیکی و خوبی کے بارے میں بھی آپ جس قدر سوچ سکتے ہیں سوچ لیں اس ضمن میں ان میں کوئی کمی نہیں پائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے کردار کو بنانے سنوارنے میں جس قدر مصروف رہتے تھے۔ اس کے لئے جس قدر وہ بے قرار رہتے تھے اس کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ دوسرے لفظوں میں ان رفقائے حسینی کی بے قراری مستقل طور پر انہیں ارتقاء کی منزلیں طے کرا رہی تھی۔ اس طرح دیکھا جائے تو ان افراد کی بے قراری کیا تھی ان کے حسن و خوبی کا سرچشمہ تھی جو انہیں ہمہ وقت سرسبز و شاداب رکھنے میں مصروف تھی۔ دوسرے بند میں تو میر انیس

نے اپنی بات کو بہت ہی واضح کر دیا ہے۔

وہ عاشق صادق تھے وہ تھے مومنِ کامل دی تھی انہیں خالق نے تمیز حق و باطل

گویا حق و باطل کی تمیز انسان کو سچا عاشق بھی بناتی ہے اور اس کے ایمان کو کمال پر بھی پہنچا دیتی ہے۔ حق و باطل کی تمیز نہ ہو تو آدمی کسی بھی فضول اور ناکارہ چیز پر ریجھ سکتا ہے۔ اور یوں اپنے جذبۂ عشق کو جذبۂ شوق کو تباہ و برباد کر سکتا ہے۔ عشق ایک فطری جذبہ ہے لیکن اس جذبے کا صحیح مصرف اسی وقت ممکن ہے کہ آدمی حق و باطل کی تمیز سے آراستہ ہو۔ اسی بند کا تیسرا اور چوتھا مصرع بھی ملاحظہ فرمائیے۔ :

کیا ہوش تھا کیا فہم تھا کیا عقل تھی کیا دل کیا حسن سے طے کر گئے وہ عشق کی منزل

ان رفقائے حسینی کے نہ ہوش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور نہ ان کی سمجھ کا اور نہ ان کی عقل اور نہ ان کے دل کا کہ جو ان کی عقل کو سنبھالے ہوئے تھا۔ کیونکہ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے عشق کی منزل کو بڑے حسن کے ساتھ طے کر رہے تھے۔ آپ نے بند زیرِ بحث کے چاروں مصرعوں کو غور سے ملاحظہ فرمایا۔ کس طرح رفقائے کی بے قراری کہیں عشق کا روپ دھار رہی ہے۔ تو کہیں ایمان کا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی بے قراری کیا تھی ایک طرح کی تمیز حق و باطل کا فریضہ انجام دے رہی تھی۔ اور پھر اس سے بڑی بات قابل ملاحظہ یہ ہے کہ ان کی بے قراری یہ سب کام بڑے ہوش و حواس' سوجھ بوجھ اور حسن و خوبی کے ساتھ پورے کر رہی تھی۔ اور اس بند زیرِ بحث کی بیعت کا تو جواب نہیں۔

محراب عبادت خمِ شمشیر کو سمجھے
جادہ وہ مسافر دمِ شمشیر کو سمجھے

اس بیت میں تو رفقائے حسینی کی بے قراری کی وہ تصویر کھینچی گئی ہے جس کو ملاحظہ کرتے وقت آدمی جتنا بھی سر دُھنے کم ہے۔ میر انیس نے خیر خواہی اور حسن وخوبی کے لئے آدمی کی تگ و دو کو جسے ہم مسلسل بے قراری کا نام دیئے جا رہے ہیں جس قرینے اور سلیقے سے اظہار کیا ہے اس کی داد دنیا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ ان رفقائے حسینی نے خم شمشیر کو محرابِ عبادت سمجھا۔ یعنی ان افراد کی عبادت انہیں ہمہ وقت دشمن کے لئے تیار رہنے کا واضح اشارہ کرتی رہتی ہے۔ عبادت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں سرِ تسلیم خم رکھا جائے۔ اور یہ خم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ بس جیسے ہی عمل کا وقت آئے آدمی عمل خیر کے لئے قدم آگے بڑھا دے۔ اور راہ خیر میں چلنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی تلوار کی دھار پر چل رہا ہے۔ واضح رہے کہ جب راہ خدا میں قدم اٹھتے ہیں تو وہ تلوار کی دھار پر زخمی نہیں ہوتے۔ بلکہ آگے کی طرف تیز تیز اٹھتے ہیں۔

رفقائے حسینی کی اس حیات افروز بے قراری کو اسی مرثیے کے ایک دوسرے بند میں میر انیس نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

مست مئے عرفاں تھے وہ سب عاقل وذی ہوش   تھی غیر خدا' سب کی انہیں یاد فراموش
دنیا سے بری بارِ علائق سے سبکدوش   دل یاد الٰہی میں جو یوں دیکھو تو خاموش
ہر دم سر تسلیم تھا خم راہ خدا میں
بڑھتے چلے جاتے تھے قدم راہ خدا میں

آپ نے ملاحظہ فرمایا میر انیس سچے اور کھرے انسانوں کی بے قراری کے لئے عقل و ہوش کو تو بنیادی طور پر ضروری سمجھتے ہیں ۔لیکن اس عقل و ہوش کے ساتھ مئے عرفاں کی سرمستی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر دنیا کی فضول اور بے کار چیزوں سے چھٹکارا نہیں ملتا۔ بار علائق سے ہلکا پھلکا اور سبکدوش ہونے کے

لئے مست مئے عرفاں ہونا بھی لازمی ہے۔ اور پھر یہ بے قراری یاد الٰہی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جس کی وجہ سے آدمی پر ایک جلال آمیز خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس کے بعد جو بیت میں میر انیس نے بے قراری کے بارے میں ایک بات بتائی ہے اس سے لطف اندوز ہونا بھی دلیل ہوشمندی ہے اس طرح کے بے قراری میں آدمی کا سر بظاہر راہ خدا میں خم ہوتا ہے۔ لیکن سر خم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کی رفتار میں کوئی کمی آجاتی ہے۔ راہ خدا پر چلنے والے کا سر ہزار خم ہو لیکن اس کی رفتار آگے بڑھنے میں کسی سے کم نہیں رہتی۔ گویا بے قراری آدمی کی رفتار کو تیز کر دیتی ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے یہ مرثیہ حبیب ابن بظاہر کے لئے میر انیس نے کہا ہے۔ اب ذرا امام حسینؑ کے اس بوڑھے دوست کی بے قراری کے مختلف پہلوؤں پر بھی غور فرمایئے۔ امام حسینؑ نے بڑی مشکل سے اپنی اس دیرینہ دوست کو میدان جنگ میں جانے کی اجازت دی ہے۔ یہ میدان جنگ میں آتے ہیں۔

پیری میں عجب شان تھی اس شیر ژیاں کی　　پڑتی تھی سراپے پہ نظر پیر و جواں کی
تھی جلوہ گری نورِ خدائے دو جہاں کی　　گرطں پہ چمک جاتی تھی سجدے کے نشاں کی
پیشانی پرنور پہ عالم تھا قمر کا
یہ چاند تھا شب کا وہ ستارہ تھا سحر کا

آپ نے بند ملاحظہ فرمایا۔ امام حسین پر قربان ہونے کی بے قراری نے حبیب ابن مظاہر میں شیرژیاں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اور چونکہ حبیب ابن مظاہر عبادت الٰہی میں بھی بہت سرگرم تھے۔ لہٰذا ان کی یہ سرگرمی اور بے قراری اب خدائے دو جہاں کا نور بن گئی تھی۔ اور سجدے کا نشان ان کی عبادت میں سرگرمی اور

بے قراری کی روشن مثال بن گیا تھا کہ اس نشان کی چمک آسمان تک پہنچ رہی تھی۔ اس بند سے اگلے بندوں میں میر انیس حبیب ابن مظاہر کے خدوخال کی تصویر کشی کر رہے ہیں لیکن ان خدوخال میں بھی حبیب ابن مظاہر کی بے قراری اپنا کام کر رہی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

باہم صفت تیروکماں ابرو و مژگاں، سرزد نہ کبھی جن سے خطا ہو کسی عنواں

یعنی حبیب ابن مظاہر اپنے آپ کو متقی اور نیک رکھنے کے لئے اتنے سرگرم رہتے تھے۔ کہ ان کے ابر و مژگان اس طرح اکٹھے تھے۔ جس طرح تیر و کمان کسی قابل تیر انداز کے ہاتھ میں ہوں کہ تیر نشانے پر جا کر بیٹھا ہے۔ یعنی ابرو مژگان کی جنبش بھی اپنے حدود میں رہتی تھی۔ یہاں بے قراری نظم و ضبط قائم رکھنے والی صفت بن جاتی ہے۔ اسی بند کا تیسرا اور چوتھا مصرع سنئے آنکھوں کی تعریف میں ہے۔

آنکھیں وہ غزالانِ حرم جن پہ ہوں قرباں نظروں سے ہو یعنی رُخ شبیر نہ پنہاں

ملاحظہ فرمائیے امام حسینؑ کے بوڑھے دوست حبیب ابن مظاہر کی آنکھیں ایسی تھیں کہ جن پر غزالانِ حرم قربان ہوتے تھے۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ آنکھیں اس بات میں احتیاط سے سرگرم رہتی تھیں کہ امام حسین کا چہرہ ان سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ حبیب ابن مظاہر کے ہونٹوں سے خوشبو اس لئے آتی تھی کہ وہ خوش سیرت خوش خصلت امام کی تعریف میں مصروف رہتے تھے۔

غنچے سے زیادہ دہن تنگ میں خوشبو اور وردِ زباں ذکرِ صفاتِ شہ خوشخو

اسی مرثیے کے ایک اور بند کی بیت ہے جس میں حبیب ابن مظاہر کے دونوں ہاتھوں کی مصروفیت بتائی گئی ہے۔

اک ہاتھ میں وہ تیغ جو لاکھوں پہ چلی ہے اس ہاتھ میں دلانِ حسین ابن علی ہے

گویا ایک ہاتھ میں دشمنوں کو تباہ و برباد کرنے کا سامان اور دوسرے ہاتھ میں خیر ہی خیر۔ خوبی ہی خوبی یعنی دامانِ حسین ابن علی ایک دو بند اسی مرثیے کے اور ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے بوڑھے مجاہد میں کیا کیا خوبیاں ہیں۔ رجز ملاحظہ ہو۔

اتنے میں رجز پڑھ کر پکارا وہ خوش انجام اے قوم! حبیب ابن مظاہر ہے مرا نام
ہشیار کہ اب میاں سے کھینچتی ہے یہ صمصام وار اس کا ہے دشمن کے لئے موت کا پیغام
یہ تیغ نہیں وہ جو دمِ حرب رکے گی
میں تم سے رکوں گا نہ مری ضرب رکے گی

گو ہاتھ میں رعشہ ہے پہ او ظالم گمراہ گر کوہ کو چاہوں تو اکھاڑوں صفت کاہ
ان ہاتھوں کی قوت سے ابھی تو نہیں آگاہ ہے قدر شناس ان کا جگر بندِ ید اللہ
پیری سے جو ہے پشت خمیدہ تو بجا ہے
جس خاک میں جانا ہے ادھر سر بھی جھکا ہے

میں وہ ہوں کہ جو فخر کروں ہے وہ سزاوار دیکھا ہے محمد کا انہیں آنکھوں نے دیدار
چوما کیا اکثر قدم حیدر کرار زہرا کی نوازش رہی شبر نے کیا پیار
بچپن سے مجھے عشق امام دو جہاں ہے
اب ساتھ ہے شبیر کا اور سیر جناں ہے

امام عالی مقام کے اس بزرگ ساتھی کا جوش و خروش کیا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے مزید بند تحریر کر رہا ہوں۔ اور اس بزرگ میں عمل خیر کے لئے اس بزرگ کی بے قراری کا کیا حال ہے۔ یہ مطالعہ بھی کچھ کم بصیرت افروز نہیں۔ بند ملاحظہ فرمائیے۔

پیری سے ہے روشن کہ چراغ سحری ہوں دنیا سے کوئی دم میں عدم کا سفری ہوں
آقا مرا شاہد ہے کہ عصیاں سے بری ہوں دیندار ہوں غازی ہوں مجاہد ہوں جری ہوں

بے خوف چلا جاتا ہوں میں شیر کے منہ پر
دعویٰ ہے کہ آؤ مری شمشیر کے منہ پر
آقا مرا وہ ہے جو امامِ ازلی ہے مظلوم ہے سید ہے ولی ابن ولی ہے
ہر جنگ میں اکثر مری تلوار چلی ہے اس شیر کے پنجے میں پلا ہوں جو علی ہے
تلوار نہ ہووے گی تو ہاتھوں سے لڑوں گا
ہر طرح سے لڑ کر اسی میداں میں گڑوں گا
مینھ تیروں کا برسے تو کبھی منہ کو نہ موڑوں نیزوں کا ہر اک بند انہیں ہاتھوں سے توڑوں
ہاتھ آؤ تو ٹکرا کے سر ایک ایک کا پھوڑوں جیتا شہ مظلوم کے دشمن کو نہ چھوڑوں
کچھ ڈھال کی حاجت نہیں مشتاقِ اجل کو
دانتوں سے چبا جاؤں گا تلوار کے پھل کو
ہے کانپتے ہاتھوں میں مرے زور خدا داد ہے جنگ یداللہ کا انداز مجھے یاد
پکڑوں جو کلائی کو تو ضیغم کرے فریاد پھر جاتا ہے پنجے سے مرے پنجۂ فولاد
کھا سکتے نہیں دیو دلیروں کا طمانچہ
ہے ضرب مرے ہاتھ کی شیروں کا طمانچہ

بے قراری اور اضطراب کا رُخ نصیحت اور سمجھانے کی طرف مڑ جاتا ہے۔

شبیر سے بے کس پہ یہ لشکر کی چڑھائی اے ظالمو کرتے ہو یہ کس گھر کی صفائی
کرتے ہو غضب اس کے نواسے سے برائی پیدا ہوئی ہے جس کے لئے ساری خدائی
فرزندِ پیغمبر پہ خطا کرتے ہو یارو
گھر لٹتا ہے زہرا کا یہ کیا کرتے ہو یارو

میر انیس کے تصورِ غربت کی اہم جہتیں

میر انیس کی ایک بیت پڑھ کر مجھے پہلی بار شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ ہم انیس کو پڑھتے ہوئے ہزار فضائے کربلا سے نکلنا چاہیں تب بھی نہیں نکل سکتے۔ حالانکہ میر انیس کے اکثر مراثی میں یوں لگتا ہے جیسے اب وہ فضائے کربلا سے نکل کر عام انسانی فضا میں داخل ہو رہے ہیں۔ لیکن دوسرے لمحے ہی احساس ہوتا ہے ابھی تک عام انسانی فضا میں اور فضائے کربلا مین جدائی کہاں پیدا ہوئی ہے کہ ہم ایک فضا میں داخل ہونے کی سچائی کو محسوس کر سکیں۔ ہاں تو میر انیس کی جس بیت کو پڑھ کر مجھے یہ احساس ہوا پہلے وہ بیت تو سن لیجئے۔ اس میں بہت سادہ سی بات کہی ہے اتنی سادہ کہ پہلے مصرع کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا

ظاہر ہے جب آپ کو کوئی جانتا ہی نہیں ہے تو آپ کو کوئی پوچھے گا کیوں۔ پوچھنے کا سوال تو اسی وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب آپ کسی کو جانتے ہوں۔ اور پھر یہ جاننے والی بات بھی کوئی ایک دو دن کی بات نہیں ہوتی۔ آدمی کو ایک

دوسرے سے شناسائی حاصل کرنے کے لئے بھی کچھ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ ویسے شناسائی کے اس عرصے کو متعین بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بعض اوقات آپ ایک دو ملاقاتوں ہی میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آجاتے ہیں کہ پھر آپس میں اجنبیت باقی نہیں رہتی۔ اور کبھی کبھی بہت وقت لگ جاتا ہے پھر بھی ایک دوسرے کے قریب نہیں آتے۔ یعنی آپ بظاہر تو ایک دوسرے سے شناسا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اجنبت دور نہیں ہوتی۔ یعنی آپ ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہی رہتے ہیں۔ اور یوں آپ پر سے عالم غربت دور نہیں ہوتا۔ بہرحال غربت کا عالم آدمی پر بے حد کٹھن ہوتا ہے۔ پس غربت کے اسی عالم کو میر انیس نے اپنی اس بیت میں بیان کیا ہے اب میں وہ پوری بیت لکھ رہا ہوں۔

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

غربت کے بارے میں پہلے مصرع کی سیدھی سادی سی بات کو دوسرے مصرع نے ایک طرح معمہ بنا ڈالا ہے۔ یا آپ اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسرے مصرع ہی سے بیت میں صحیح معنی میں شعریت پیدا ہوئی ہے۔ ورنہ ہم پہلے مصرع کی بات کو معمولی بات سمجھتے ہیں۔ مگر وہی بات کہ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ اگر آپ پر غربت کا عالم ذرا مسلسل گذرنے لگے۔ تو آپ کو پتا چلے کہ کسی کا آپ کو نہ پوچھنا کس قدر اہم صورت حال ہے۔ اور اس صورت حال کا آپ کی پوری زندگی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ پوچھنا تو بڑی بات ہے اگر کوئی چلتے ہوئے آپ کو ہیلو بھی کہہ دیتا ہے یا آپ کے سلام کا جواب بھی دیتا ہے یا آپ کو سلام کا اشارہ بھی کر دیتا ہے۔ تو آپ کی پوری ذات میں ایک ایسی توانائی آجاتی ہے جس کا آپ کو احساس صحیح معنی میں اسی وقت ہوتا ہے جس وقت کوئی آپ کو ہیلو نہ کہے

یا آپ کے سلام کے جواب میں سلام نہ کہے یا آپ کو سلام کا اشارہ نہ کرے۔ غرض آدمی کو آدمی کا نہ پوچھنا اتنی بڑی تکلیف دہ بات ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی صورت حال کو میر انیس نے اپنی بیت زیر بحث میں پیش کیا ہے۔ اور اس بیت کے دوسرے مصرع میں پہلے مصرع کی بظاہر معمولی بات کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ ہاں تو میں پہلے مصرع اول دوبارہ لکھتا ہوں۔

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا

پوچھنے والا نہ ہو تو کیا ہو جاتا ہے۔ ذرا دوسرا مصرع سماعت فرمائیے۔

شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

آپ نے ملاحظہ فرمایا غربت میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اور یہ اندھیرا ایسا ہوتا ہے کہ اسے روشنی کے عام ذرائع کو استعمال میں لا کر دور نہیں کیا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں یہ انسان کے لئے عالم تنہائی سے بڑھ کر تکلیف دہ صورت حال ہوتی ہے۔ یا آپ اسے یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ عالم تنہائی ہی کی انتہا درجہ کی ایک صورت حال ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ جو ہمیں ہماری عام اور معمول کی زندگی میں سب کچھ نظر آتا ہے۔ ہمارے حواس درست رہتے ہیں' ہماری دیکھنے' سننے' چھونے' سونگھنے اور چکھنے کی صلاحیتوں برقرار رہتی ہیں۔ یہ سب صدقہ ہوتا ہے ہمارے اردگرد کے ابنائے جنس کا' ان کی توجہ کا' ان میں ہمارے ہونے کے احساس کا' ہم سے ان کے میل جول کا' اب اگر یہ سب کچھ ختم ہو جائے یا ہم گوشۂ تنہائی میں جا کر بیٹھ جائیں تو کچھ دیر بعد ہمارے یہ سب ہوش و حواس جواب دے جاتے ہیں۔ شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا۔ یہ مصرع اپنی جگہ میر انیس کی فصاحت اور بلاغت کا بہترین نمونہ ہے بلکہ کمال کا نمونہ ہے۔ اسی طرح اپنی فصاحت اور بلاغت کے

اعتبار سے اس بیت زیر بحث کا پہلا مصرع بھی کمال کا ہے۔ غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔

لیکن غربت کا عالم انسان پر وطن سے دور جا کر ہی وراد نہیں ہوتا۔ عین وطن میں بھی آپ غربت کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس کا سبب ایک آپ کی ذات ہو سکتی ہے۔ دوم اس کا سبب دوسرے لوگ ہو سکتے یں۔ اگر آپ خود اپنے ارد گرد کے لوگوں سے اچھی طرح نہیں ملتے تو آپ غربت کوگویا خود اپنی ذات پروارد کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ لوگ آپ کو نہ سمجھ رہے ہوں یا بوجوہ انہیں آپ کی معرفت نہ ہو رہی ہو۔ تو ایسی صورت میں بھی آپ غریب ہی رہتے ہیں۔ میر انیس کا کمال بلاغت یہی ہے کہ انہوں نے اپنی بیت زیر بحث میں اس طرح کی کوئی تقسیم نہیں کی بس سیدھے سادے الفاظ میں غربت کی صورت حال کو آپ پر واضح کر دیا ہے۔ جہاں تک ان سوالات کا تعلق ہے۔ کہ آپ غریب ہیں بھی یا نہیں۔ اور اگر غریب ہیں تو کس طرح کے غریب ہیں؟ آپ نے غربت کو خود اپنے آپ پر وارد کیا ہے یا آپ کے معاشرے کے دیگر افراد نے آپ کوغریب بنایا ہے۔ ان تمام سوالات کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ یعنی ان تمام سوالات کے جواب آپ کوخود دینے ہیں۔ بلکہ ان سوالات کے جواب آپ کو دینے چاہئیں۔ اگر آپ ان سوالات کی طرف سے غفلت اختیار کرتے ہیں۔ تو گویا آپ اپنی ذات سے خودغریب ہوئے جا رہے ہیں۔ اور اپنی غربت کو دورنہیں کرنا چاہتے۔ غربت کو دور کرنا اصل میں زندگی کو سرسبز و شاداب کرنے کے مترادف ہے ۔ کیونکہ جس معاشرہ میں آدمی غریب ہو جاتا ہے۔ پھر نہ وہ اس معاشرے کے قابل رہتا ہے اور نہ معاشرہ اس کے قابل رہتا ہے۔ آدمی تنہا غریب نہیں ہوتااس کے ساتھ معاشرے کے دوسرے افراد بھی غریب ہو جاتے ہیں۔ اب

یہ ایک بالکل الگ سا سوال ہے کہ معاشرے کے افراد اپنی غربت کے احساس ہی سے عاری ہوں۔

محمدؐ و آل محمدؑ کی زندگیوں کا سب سے بڑا المیہ یہی تھا کہ معاشرہ اور اس کے افراد ان کے لئے غریب نہیں تھے۔ ان کے یعنی محمدؐ و آل محمدؑ کی کوشش ہمیشہ یہی رہی کہ جس طرح وہ اپنے معاشرے کے افراد کے دکھ درد اور مسرت و انبساط کو سمجھتے ہیں اس طرح معاشرے کے افراد بھی ان کے یعنی محمد و آل محمد کے دکھ درد کو اور خوشی و انبساط کو سمجھیں لیکن اس وقت کے افرادِ معاشرہ اپنی رجعت پسندی اور کج فہمی کے باعث محمد و آل محمد کو نہیں سمجھ پا رہے تھے۔ ادھر محمد و آل محمدؐ نے لوگوں کو سمجھانے میں کبھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ آپ جانتے ہیں انسان کا سب سے بڑا اختیار سمجھنے کا ہے یعنی انسان جتنا سمجھنے کے ضمن میں آزاد ہے ایسی آزادی اسے کسی دوسرے عمل میں نصیب نہیں اسی لئے آپ نے دیکھا ہو گا کہ جہاں کچھ سمجھانے کا مسئلہ آتا ہے وہاں یہ ذمہ داری اللہ رسولؐ پر نہیں ڈالتا بلکہ قل کہہ کر یہ ذمہ داری اپنے سر مول لے لیتا ہے۔

ہاں تو غربت کا ایک اہم ترین اور کرب ناک پہلو یہ ہے کہ آپ تو لوگوں کے دکھ سکھ اور غم و خوشی میں برابر کے شریک ہوں لیکن لوگوں کا آپ کے دکھ سکھ میں شریک ہونا تو بڑی بات ہے وہ آپ کی عمومی صورت اخلاق ہی کی طرف توجہ نہ دیں اب آپ خود بتائیے ایسی صورت میں زندگی کیسی کرب ناک نہیں ہو جاتی ہے۔ آنحضرتؐ کے لئے سب سے بڑے کرب کی صورت یہی تھی۔ وہ مسلسل لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں مصروف رہے اور اہل بیت اور اصحاب پاکؓ کو چھوڑ کر لوگوں نے عموماً اور مسلسل ان کی طرف سے عدم توجہی کا مظاہرہ کیا۔ اور اگر آپ میں اس حقیقت حال کو گوش گذار فرمانے کی جرأت ہے تو

سن لیجئے کہ یہ عدم توجہی کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ایک طرف محمد و آل محمد کا غربت پن ہے اور دوسری طرف پوری مسلم امہ بری طرح غربت کا شکار ہے۔ امت کو محمد و آل محمد سے جتنا قریب ہونا چاہئے تھا۔ وہ اتنی قریب نہیں ہے۔ اس ضمن میں مسلم امہ کے سب فرقے برابر کے شریک ہیں۔ کہنے کو سب قریب ہیں اور عملا کوئی بھی قریب نہیں۔ ہمیں من حیث القوم من حیث الملت اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہونی چاہئے کہ کم از کم تسلیم کرنے سے بھی بہت کچھ بات بن جانے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔

محمدؐ و آل محمد کی تعلیم یہی تو ہے نا کہ مسلمان پورے صدق دل سے اللہ پر ایمان لائیں' آخرت پر ایمان لائیں۔ نبی آخرالزمان کے پیغام اور اللہ کی کتاب قرآن پر ایمان لائیں اور آنحضرتؐ کے اسوۂ حسنہ پر ایمان لائیں اگر اس طرح مسلم امہ کا ایمان مکمل ہو جائے تو اس پر یعنی مسلم امہ پر کبھی غربت نہیں چھا سکتی۔ یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی بات کو سمجھے اس کی ذات کو سمجھے جس کے نتیجے میں صحیح معنی میں ملت میں اخوت پیدا ہو۔ آنحضرتؐ نے اپنے اصحابؓ پاک کو اور اپنے اہل بیت کو اپنی تعلیم و تربیت سے اسی لئے نوازا تھا کہ پوری مسلم امہ اسوۂ حسنہ پر چل کر اخوت کی رشتہ میں منسلک ہوتے ہوئے دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن جائے۔ لیکن افسوس صد افسوس ایسا نہیں ہو سکا۔ بغور دیکھا جائے کہ آج تمام عالم اسلام غربت کے عالم میں ہے۔ جی ہاں بیت زیر بحث کے مطابق

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

جہاں تک مادی وسائل کا تعلق ہے۔ مسلم ممالک میں کس چیز کی کمی ہے۔ قدرت نے سبھی کچھ تو دیا ہوا ہے۔ لیکن قدرت کے اس دیئے ہوئے سرمایے کی

روشنی سے ہمارے گھر ہمارے شہر ہمارے ملک روشن نہیں ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہم میں آپس میں اتفاق نہیں ہے۔ اتفاق اور اتحاد کے نور سے جب تک ہمارے دل روشن نہیں ہونگے ہماری فضاء زندگی پر اندھیرے ہی چھائے رہیں گے۔ محمد و آل محمد یہی سمجھاتے رہے لیکن مسلم امہ نے تاحال اس بات کو نہیں سمجھا۔ کربلا میں ہر جان پر کھیلنے والا آخر دم تک یہی سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر ہر شہید کے پیغام پر اور سب سے بڑھ کر نواسۂ رسول حضرت امام حسین کے اس پیغام اخوت پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ انیس کے ایک مرثیے کے حوالے سے سب عزیز و اقربا شہید ہو چکے ہیں۔ امام حسین بیکسی کے عالم میں ہیں لیکن امت کا خیال دامن گیر ہے۔

حضرت پہ اِدھر ہوتی ہے اعدا کی چڑھائی تنہا ہیں نہ بیٹا نہ بھتیجا ہے نہ بھائی
سیدانیاں دیتی ہیں محمد کی دہائی ہلا میں یہ غل ہے کہ کرو فتح لڑائی
ڈوبے ہوئے خوں میں شہداء گرد پڑے ہیں
گھوڑے پہ اکیلے شہہ ابرار کھڑے ہیں

اس مرثیے کے اگلے بند کی بیت ہے۔

یہ شوقِ شہادت ہے شہنشاہ زمن کو
بوچھاڑ سے تیروں کے بچاتے نہیں تن کو

اس سے آگے بند اس طرح شروع ہوتا ہے

ہیں آگ میں خیموں کے کھڑے پر نہیں کچھ غم امت پہ نہ آنچ آئے دعا ہے یہی ہر دم

اسی طرح اس سے آگے کے بند کی بیت ہے۔

پانی کے بھی طالب نہیں گو تشنہ دہن ہیں
کلمے ہیں نصیحت کے محبت کے سخن میں

یہ تو امام عالی مقام کی بات تھی اب امام عالی مقام کے ساتھیوں کے

بارے میں بھی سن لیجیے۔ میر انیس اپنے ایک مرثیے کو اس طرح شروع کرتے ہیں۔ دیکھ لیجیے یہ کربلا کے غریب لوگ تھے۔

جب غازیانِ فوج خدا نام کر گئے　　لاکھوں سے تشنہ کام لڑے کام کر گئے
امت کی مغفرت کا سر انجام کر گئے　　فیض اپنا مثل ابر کرم عام کر گئے
پڑھتے ہیں سب درود جو ذکر ان کے ہوتے ہیں
ایسے بشر وہ تھے کہ ملک ان کو روتے ہیں

مندرجہ بالا بند میں ایک مصرع خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہے۔ فیض اپنا مثل ابر کرم عام کر گئے۔ بظاہر یہ مصرع اپنے سے قبل مصرع کی تفسیر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ نے دیکھا اس سے پہلا مصرع یہ ہے۔ امت کی مغفرت کا سر انجام کر گئے۔ مطلب یہ ہے کہ شہادت کے وقت ان کے سامنے صرف اللہ کی ذات یا امام حسین کی ذات نہیں تھی۔ ان کے حوالے سے ان کے پیش نظر پوری امت کی بھلائی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح بادل برستا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا ہے کہاں برسے وہ ہر جگہ کو سیراب کرتا ہے۔ اس سے ہر جگہ فیض یاب ہوتی ہے۔ انہی امام حسین کے ساتھیوں کے بارے میں میر انیس اگلے بند میں فرماتے ہیں۔

دیندار و سرفروش و شجاع و خوش اعتقاد
ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں خدا کی یاد

دین دار بھی سرفروش بھی بہادر بھی اور اعتقاد میں بھی صاف ستھرے۔ پہلے مصرع کی یہ صفات اپنی جگہ لیکن ان صفات کا عملی ثبوت دوسرے مصرع میں کس خوبصورتی کے ساتھ دیا گیا ہے۔ ان افراد کے ہاتھوں میں یقیناً تلواریں تھیں اور حق کی راہ میں وہ لڑنے پر آمادہ تھے لیکن اس ظاہر کیساتھ ان کے باطن کا یہ حال تھا کہ ان کے دل خدا کی یاد سے بھرپور ہے۔ ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں

خدا کی یاد۔ آپ اس مصرع کو جتنی بار دہراتے ہیں ان افراد کے یادِ خدا سے لبریز اجسام کے جلوے اس حساب سے نو بہ نو اور تر و تازہ نظر آئیں گے۔ ان خدا کے جیالوں کی نئی سے نئی تصویریں آپ کے قلب و نگاہ کو روشن کر جاتی ہیں۔ یہ افراد اپنی جگہ ایسے بے مثال تھے کہ زمانہ انہیں تا بہ ابد یاد رکھے گا۔

برسوں رہے گا چرخ میں گر آسمانِ پیر
لیکن نظر نہ آئے گا ان کا کہیں نظیر

اس بند کا ایک مصرع ہے۔ خورشید جن کے سامنے اک ذرۂ حقیر۔ اس کے بعد اگلا بند ہے۔

رستم اٹھا نہ سکتا تھا سر ان کے سامنے   شیروں کے کانپتے تھے جگر ان کے سامنے
پھیکی تھی روشنی قمر ان کے سامنے   اُڑتا تھا رنگِ روئے سحر ان کے سامنے
بخشا تھا نورِ حق نے ہر اک خوش صفات کو
ہوتا تھا دن جو گھر سے نکلتے تھے رات کو

اور ان افراد میں یہ صفات کیسے پیدا ہوئیں۔

تاثیر کر گئی تھی انہیں صحبت امام   تھا نزع میں بھی خشک لبوں پر خدا کا نام
لبریز تھے محبت حیدر میں دل کے جام   ذی قدر ذی شعور دلاور خجستہ کام

یہاں سوچنے اور ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ان افراد کا خاندانِ رسالت سے براہ راست تعلق نہ تھا لیکن امام عالی مقام کی صحبت کا ان پر یہ اثر ہوا کہ عالم نزع میں خشک لبوں پر خدا کا نام آرہا ہے اور محبت حیدر نے انہیں ذی قدر بنا دیا ذی شعور بنا دیا پھر یہ دلاور بھی تھے اپنے کام میں پختہ اور مبارک بھی ۔ جب صحبت امام کا یہ اثر ہے تو صحبت رسولؐ کا کیا اثر نہیں ہو گا۔ ذی شعور مسلمان اسی لئے اہل بیت رسولؐ کو بلند مرتبہ اور عالی قدر گردانتے ہیں کہ انہیں

صحبت رسولؐ میسر آئی تھی۔ اور صرف محبت ہی نہیں پوری طرح پرورش اور تعلیم و تہذیب بھی۔ بہرحال خود امام عالی مقام اور ان کے ساتھی میدان کربلا میں غربت کے انتہائی درجے پر تھے۔ لیکن ان غربا کا اپنے رسولؐ کی امت سے براہ راست رابطہ تھا اور یہ رابطہ اور ضابطہ آخر وقت تک قائم رہا کہ آخر وقت تک ان پاکیزہ نفوس نے امت کے لئے دعائیں کی ہیں۔ ان افراد نے غربت کے عام تصور کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ آدمی ہمت اور حوصلے سے کام لے تو انتہائی رجے کی غربت کے عالم میں بھی ایک آفاقی انسانی معاشرہ سے پورا تعلق قائم رکھ سکتا ہے۔ اور اسے یہ نہیں کہنا پڑتا کہ شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا۔ دراصل یہ نفوس اپنے دلوں کی شمعیں روشن رکھتے ہیں اور جب انسان اپنے دل کی شمع روشن رکھتے ہوئے یعنی انسان اپنے دل کی شمع روشن رکھنے کی جرأت سے فیض یاب ہوجاتا ہے پھر اسے دنیا کا کوئی اندھیرا بینائی سے محروم نہیں رکھ سکتا۔ میرانیس نے عام غربت کے تصور کو پیش کرکے ایک اعلیٰ تصور غربت کی طرف بھی ہمارے ذہنوں کو منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم اعلیٰ کی طرف اسی وقت جا سکتے ہیں۔ جب ہمارے ذہن میں ادنیٰ کا تصور بھی واضح ہو اور انیس نے بیت زیر بحث میں غربت کے اسی ادنیٰ تصور کی انتہائی صورت کو پیش کیا ہے۔ لیکن اب غربت کا اعلیٰ تصور بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ جب تمام عزیز و رفقا حضرت علی اکبر سمیت شہید ہو چکے۔ تو امام مظلوم تنہا میدان کارزار میں تشریف لاتے ہیں۔ اس مرثیہ کے آغاز کے تیور ہی قابل صد غور ہیں۔

جب جنگ کو میداں میں شہ تشنہ لب آیا اعدا میں پڑا غل کہ امیر عرب آیا
اس فوج پہ آفت ہوئی، نازل غضب آیا لب تک لے آیا تھا نہ غصہ پہ لب آیا

کیا شاد تھے سب مار کے ہم شکل نبی کو
اب روکے کوئی سبط رسول عربی کو

یہ عجیب عالم غربت ہے اور انیس نے اس عالم غربت کے روحانی پہلو سے قطع نظر زیادہ تر انسان کی نفسیاتی پہلو کا اظہار کیا ہے۔ دشمن کی فوج کو خیال تھا کہ سب عزیز اور فوج کے علمدار حضرعباس ''سمیت شہید ہو چکے ہیں اور تو اور حضرت امام حسینؑ کا کڑیل جوان بیٹا علی اکبر بھی شہید ہو چکا ہے اب تو امام حسین بہت نڈھال ہو گئے اب وہ میدان میں آ کر کیا جنگ کرسکیں گے لیکن جس انداز سے امام مظلوم میدان جنگ میں آتے ہیں اسے دیکھ کر تمام فوج پریشان ہو گئی۔ اس بند کا پہلا مصرع ہی امام عالی مقام کی کیفیت کا اظہار انوکھے انداز میں کر رہا ہے۔ یعنی میدان جنگ میں ایک پیاسا تشنہ لب بادشاہ آیا ہے۔ اور پھر پیاسا بادشاہ بھی وہ جس کا کڑیل جوان بیٹا ابھی ابھی شہید کیا گیا ہے۔ لہٰذا انسانی نفسیات کے پیش نظر امام حسین کے صبر کا پیالہ ایک طرح بھر چکا ہے انہوں نے اب تک بہت ضبط کیا۔ اب تک اسے آیا تھا نہ غصہ پر اب آیا'' لیکن اب ضبط کا یارا نہیں۔ فوجِ دشمن کا اندازہ غلط تھا۔ کہ کڑیل جوان بیٹے کے غم میں اب امام حسین سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔ ''اب روکے کوئی سبط رسول عربی کو'' اس مصرع سے امام حسین کی نفسیاتی کیفیت میں روحانی کیفیت بھی شامل ہوجاتی ہے اور اسی لئے امام کی طاقت کا اس وقت اندازہ لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ ظلم کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب اپنے تمام لہو لہان جسم کے باوجود امام عالی مقام لڑ کر دکھائیں گے۔ اور امام مظلوم نے اپنے تن پاش پاش کے باوجود اورخون میں ڈوبے ہوئے ہونے کے باوصف خوب جنگ کی۔ یہ امام کی غربت کی جنگ تھی۔ تمام عزیز و رفقاء کے مرنے کے بعد کی جنگ۔ لیکن امام مظلوم فرما رہے تھے۔

پرغم نہیں کچھ پاس نہ ہونے سے کسی کے اللہ تو ہے سر پہ حسین ابن علی کے

اگلا بند اس طرح شروع ہوتا ہے۔

گو خشک دہن میں ہے زباں کشنہ لبی سے بندہ وہ جسے کام ہو خالق کی خوشی سے

پھر جائے اگر سارا جہاں سبطِ نبی سے نومید نہ ہوں ذاتِ جناب احدی سے

تنہا مرے ہونے میں کچھ اسرار نہاں ہے

وہ خوب سمجھتا ہے مجھے فہم کہاں ہے

اب یہ مادی غربت کے ساتھ ساتھ روحانی غربت کا عالم ہے جس کے زور پر امام عالی مقام فرما رہے ہیں۔

پھر جائے اگر سارا جہاں سبطِ نبی سے نومید نہ ہوں ذاتِ جناب احدی سے

عام غربت کیا چیز ہے امامِ مظلوم تو غربت کی انتہا کو بھی اس وقت نظر میں نہیں لا رہے ہیں۔ سارا جہاں بھی اگر امام کو چھوڑ دے اور انہیں غریب کر دے تو امام کو کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ امام کو یقین ہے کہ حقیقت عظمیٰ ان کے ساتھ ہے۔ اور اسی رفاقت کے باعث وہ اپنے امام ہونے پر اپنی ذات میں بلا کی توانائی محسوس کرتے ہیں۔

بابا کی طرح مجھ میں بھی ہے زورِ امامت

اور اسی زور کی بنا پر دشمنوں سے کہہ رہے ہیں۔

اک پل میں اگر چاہوں تو کر دوں تمہیں غارت

اس بند کی بیت میں اللہ کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔

آج اس کے کرم سے سبھی مقدور ہے مجھ کو

پر اس کی جو مرضی وہی منظور ہے مجھ کو

اور اس سے آگے کے بند کی بیت ہے۔

تنہائی میں بھی تابع مرضی خدا ہوں
نانا تھے فدا مجھ پہ میں امت پہ فدا ہوں

امام عالی مقام پہلی بیت میں فرما رہے ہیں کہ ہزار غربت کے باوجود مجھ میں ہر طرح کا مقدور ہے۔ میں جو چاہوں وہ کر سکتا ہوں لیکن مجھے تو خدا کی مرضی اور خدا کی خوشی مطلوب ہے۔ میں نے اپنے آپ کو اپنی ذات کے جملہ امکانات کو حقیقتِ عظمیٰ پر چھوڑ رکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سے لو لگانے کے بعد آدمی کسی طرح بھی غریب نہیں رہ جاتا۔ اس کا خواہ دنیا میں کوئی نہ ہو۔ خدا تو ہوتا ہے اور اتنا بڑا سہارا ہے کہ پھر کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس لئے اگلے بند کی بیت میں فرما رہے ہیں ۔ مجھ پر ہزار غربت کا عالم گزرے میں چاہے کتنا بھی تنہا ہو جاؤں لیکن اگر مرضی خدا میرے ساتھ ہے تو مرضی خدا کا تابع ہونا ہر طرح کی غربت کو دور کر دیتا ہے اور میں ویسے بھی کیسے غریب کہلا سکتا ہوں جبکہ نانا نے میرے ساتھ محبت کی ہے اور مجھے نانا کی امت سے محبت ہے اور میں اسی محبت میں اپنے نانا کی امت پر قربان ہو رہا ہوں۔ گویا ایثار و قربانی تو انسان کی بڑی سے بڑی غربت کو دور کر دیتی ہے۔ امت کو میرا خیال نہ بھی ہو تو یک طرفہ محبت بھی اپنا کام کر جاتی ہے۔ کیونکہ جذبۂ محبت اتنا بڑا ساتھی ہے کہ اس کی رفاقت کے بعد کسی دوسری رفاقت کی ضرورت نہیں رہتی۔ غرض انیس نے اپنے مراثی میں غربت کے ایسے ایسے پہلو دکھائے ہیں کہ جن کو دیکھ کر جدید عمرانیات کے بہت سے مسائل نہ صرف حل ہوتے محسوس ہوتے ہیں بلکہ ان مسائل سے انسانی معاشرہ کی نصیب بھی جاگتے نظر آتے ہیں۔

دراصل اس طرح کی غربت میں جو حقیقت عظمیٰ سے تعلق پیدا ہونے کے باعث ایک طاقت اور توانائی پیدا ہوتی ہے اس کے امکانات کا احاطہ کرنا آسان

نہیں۔ مگر چونکہ امام مظلوم تو ایک راہنما اور ہادی تھے اس لئے انہیں ان امکانات کا یہ پورا پورا اندازہ تھا جس کے زور پر وہ اپنی غربت بڑے تیقن کے ساتھ سنبھالے ہوئے تھے اور حقیقت میں ایسا ہی ہوا آج بھی امام عالی کی غربت کے سہارے ہم لوگ اپنے قدم راہ انسانیت میں بہت آگے بڑھا سکتے ہیں۔ جی ہاں ہم اس طرح اس غربت سے آگے قدم بڑھا سکتے ہیں۔ جن کا ذکر میر انیس نے اپنے زیر بحث شعر میں کیا ہے۔ میں وہ شعر پھر لکھے دیتا ہوں۔

غربت میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا
شمعیں بھی جلاؤ تو اجالا نہیں ہوتا

شیدائے آلؑ شیفتہ واجب الوجود

ہم آپ سے سب جانتے ہیں کہ میر انیس جہاں بیان اور تفصیل کے قادر الکلام شاعر ہیں۔ وہاں وہ اختصار میں بھی کمال دکھانے کی مہارت رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہوشمند قاری کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ اور انیس ایک مصرع کے کوزے میں واقعی دریائے معانی کو اس طرح بند کرتے ہیں کہ کوزہ کوزہ نہیں رہتا۔ سمندر نظر آنے لگتا ہے۔ اور مصرع مصرع نہیں رہتا۔ ایک دیوان کیا کئی دیوانوں کا مجموعہ بن جاتا ہے ۔ اب دیکھئے یہ مصرع جس کو میں نے عنوان قرار دیا ہے میر انیس کے ایک مرثیے کا مصرع ہے مگر اس مصرع میں میر انیس نے ایک بہت بڑی حقیقت کا انکشاف کیا ہے اور اس انکشافِ حقیقت کے ساتھ امت مسلمہ کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔ سب سے پہلے اس مصرع زیر بحث کے پہلے جز کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے بھی پہلے میں یہاں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ مصرع زیر بحث میر انیس کے اس مرثیے کے پانچویں بند کا چوتھا مصرع ہے جس مرثیے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔ ''جب غازیانِ فوجِ خدا نام کر گئے۔'' اور پانچواں بند بھی ذیل میں پورا لکھ رہا ہوں جس میں سے مصرع زیر بحث لیا گیا

ہے۔ اور یہ بھی واضح کردوں کہ غازیانِ فوج خدا سے محبان اہل بیت مراد ہے۔ اہل بیت کو اختصار کے ساتھ آل بھی کہتے ہیں۔جیسا کہ مصرع زیر بحث میں کہا گیا ہے۔ہاں تو وہ پانچواں بند ملاحظہ فرمائیے۔

پیشانیوں پہ جلوہ نما اختر سجود دیکھیں جو ان کا نور تو قدسی پڑھیں درود
رخ سے عیاں جلال و جوانمردی و نمود شیدائے آلِ شیفتۂ واجب الوجود
جینے کی شاہِ دیں کو دعا دے کے مر گئے
ایماں کے آئینے کو جلا دے کے مر گئے

محبان اہل بیت کیسے تھے محبانِ اہل بیت کو کیسا ہونا چاہئے اس بند میں یہی وضاحت کی گئی ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ اس بند میں بتایا گیا ہے محبان اہل بیت اس طرح کے تھے۔ اور اس طرح کے ہوتے ہیں۔ ان کی پیشانیوں پر کثرتِ عبادت سے جو نشان تھے وہ ستاروں کی طرح چمک رہے تھے یعنی محبان اہل بیت کے ماتھے سجدوں کی زیادتی سے چمک اٹھتے ہیں۔ اور محبانِ اہل بیت کی پیشانیوں کا نور دیکھ کر قدسی درود پڑھتے ہیں۔ اور ان کے یعنی محبانِ اہل بیت کے چہروں سے جلال بھی نمایاں ہوتا ہے ان کی جوانمردی جرأت ہمت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اور یوں ان کی شان بھی آشکار ہوتی ہے اور یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ وہ آل کے یعنی رسول کے اہل بیت کے شیدا ہوتے ہیں۔ اور اہل بیت کی محبت کے باعث وہ واجب الوجود یعنی اللہ کے بھی عاشق ہو جاتے ہیں۔

اس معمولی سی لفظی وضاحت کے بعد اب اصل مصرع زیر بحث کی معنوی وضاحت کی طرف آیئے۔ میری پہلی گذارش جو اس ضمن میں ہے وہ یہ ہے کہ اگر تنگ نگاہی سے دیکھا جائے تو میر انیس کا عقیدہ ایک شیعی عقیدہ تھا لیکن اگر وسعت نگاہ سے دیکھا جائے تو میر انیس کا عقیدہ ایک عام مسلمان کا عقیدہ ہے۔ جس طرح

اہل بیت رسولؐ یا آل رسول سے ہر مسلمان عقیدت رکھتا ہے۔ اور ہر مسلمان کو عقیدت رکھنے کا حق حاصل ہے اسی طرح میر انیس کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہئے۔ اور انہیں یہ حق تھا چنانچہ اگر انیس کی عقیدت کو ایک عام مسلمان کی عقیدت سمجھا جائے اور یوں اس کے عقیدے کو کسی خاص گروہ سے متعلق نہ سمجھا جائے تو یہ انیس کے ساتھ عین انصاف ہوگا۔ میر انیس بنیادی طور پر ایک مسلمان تھے اور میر انیس کی یہ بنیاد اس اعتبار سے زیادہ مضبوط کہی جا سکتی ہے کہ میر انیس کو محمدؐ و آل محمدؐ سے براہ راست عقیدت تھی اور اس طرح کی عقیدت ہر اس مسلمان کو ہوتی ہے اور ہوسکتی ہے جو اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ رسولؐ نے اپنے اہل بیت یعنی حضرت علیؑ جناب فاطمہ الزہراؑ اور حسنؑ و حسینؑ کو پوری طرح تعلیم و تربیت سے مشرف فرمایا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس تاریخی حقیقت کو ہر ذی شعور اور منصف مزاج مسلمان سمجھتا ہے اور ایک مسلمان کے لئے اس تاریخی حقیقت' کو سمجھنا ہی وہ بڑا شرف اور عرفان ہے جو اس کے عقیدے کی صحیح معنی میں تہذیب اور تطہیر کرتا ہے۔

زیر بحث مصرع ''شیدائے آل شیفتہ واجب الوجود'' میں شیدائے آل کا مطلب یہ کہ وہ شخص یا اشخاص جو آل محمدؐ کی محبت میں بڑی گہرائی کے ساتھ اترے ہوئے ہیں شامل ہیں وابستہ ہیں مبتلا ہیں جیسے پلیٹس نے اپنی لغت میں لکھا ہے۔ Deeply in love پھر ایسے اشخاص واجب الوجود کے بھی شیفتہ ہو جاتے ہیں۔ انہیں حقیقت عظمیٰ کے ساتھ بھی اسی گہرائی سے محبت ہوتی ہے۔ آل رسول کی محبت انہیں خدا کی محبت میں بھی اسی شدت اور گہرائی سے مبتلا کرتی ہے جس شدت اور گہرائی سے وہ آل رسول کی محبت میں مبتلا شامل اور مصروف ہوتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے؟

ایسا اس لئے ہے کہ براہ راست کوئی اللہ کی محبت میں اس لئے گہرائی کے ساتھ محو نہیں ہو سکتا کہ اس کے دل میں یہ کسک رہتی ہے کہ اس طرح اللہ سے محبت کرنا کہیں خالی وہم وگمان سے محبت کرنے کے مترادف تو نہیں ہے۔ انسان فطرتاً اپنی محبت کے لئے ٹھوس ثبوت چاہتا ہے۔ اور اس ٹھوس ثبوتیت کے تحت انسان نے بت پرستی کی ابتدا کی تھی۔ اللہ نظر نہیں آتا۔ بت نظر آتے ہیں۔ انسان اللہ کو بھی اپنے حواس کے ذریعے دیکھنا' چکھنا' سونگھنا' چھونا اور سننا چاہتا ہے اور وہ یعنی انسان بت کو چھو بھی سکتا ہے' دیکھ بھی سکتا ہے' چکھ بھی سکتا ہے۔ سونگھ بھی سکتا ہے۔ اور سن بھی سکتا ہے۔ اللہ نے انسان کی اسی حواس پرستی کے تحت اپنی شناخت کے لئے پیغمبروں اور رسولوں کو اپنے پیغام کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ پیغمبر جب انسانوں کو اللہ کا پیغام دیتے ہیں۔ تو انہیں یعنی انسانوں کو اور ان کے حواس کو یہ تسلی اور تشفی ہوتی ہے کہ اللہ کا پیغام پہنچانے والا اور اللہ کے ہونے کی خبر دینے والا ان ایسا ہی گوشت پوست کا ایک انسان ہے۔ اور جب پیغمبر کے ہاتھوں معجزے وقوع میں آتے ہیں تو اسے یعنی انسان کو اپنے سے عظیم ہستی کا نہ صرف احساس اور عرفان ہوتا ہے بلکہ انسان کی اس اعلیٰ رسائی کا بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ کس بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ مگر یہ یقین اسی وقت تک ناپختہ رہتا ہے۔ جب تک وہ پیغمبر کے ساتھ دوسری عظیم شخصیتوں کو بھی پیغمبر کے اسوۂ حسنہ پر گامزن نہیں دیکھ لیتا اگر ایسا نہ ہو تو پیغمبر تنہا رہ جاتا ہے۔ اسی لئے پیغمبر کے ساتھ کوئی نہ کوئی اس کے اہل بیت میں سے اور اصحاب میں سے ضرور اس گواہی کے لئے موجود ہوتا ہے۔ ہمارے پیغمبر آخر الزمان کے اہل بیت میں سے ایک نہیں چار ہیں جن کی آنحضرتؐ نے براہ راست تعلیم و تربیت فرمائی اور اصحاب پاکؓ بھی ایک دو نہیں کئی۔ حضرت علیؓ حضرت فاطمہ الزہراؓ اور امام حسنؓ و حسینؓ کو یہ خاص شرف حاصل ہے کہ انہیں تعلیم و تربیت

رسول کے زیادہ مواقع میسر آئے اسی لئے یہ نفوس اپنی اہل اولاد میں سے اہل افراد کو اسوۂ حسنہ کی تعلیم و تربیت سے مشرف کر سکے۔ اور اس کے لئے مسلم امہ ان نفوس مقدسہ کو خاص اہمیت دیتی ہے۔ مگر ان نفوس میں یعنی آل رسول سے محبت کرنا آسان کام نہیں چنانچہ آل رسول سے محبت کرنے کا دعویٰ کرنا تو آسان ہے اس پر عمل پیرا ہونا اور علم و عرفان کے ساتھ عمل پیرا ہونا آسان نہیں۔ مجھے اہل تشیع معاف فرمائیں ان کے ہاں بھی آل رسول سے محبت کا دعویٰ تا حال عموماً محض زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دعویٰ کی رسائی عمل تک محسوس نہیں ہوتی۔ ورنہ چند سچے عاشقانِ آل رسول پوری مسلم امہ ہی میں نہیں تمام عالم انسانیت میں ایک انقلاب خیر و خوبی برپا کر سکتے ہیں۔

اصل میں جو واقعی شیدائے آل ہوتا ہے۔ وہ تعلیم و تربیت رسول کو آل محمد کے صدقے سے اپنی ذات میں جذب کرتا ہے اور اسی جذب کی بدولت اس کی دنیا ہی نہیں بدل جاتی اس کے آس پاس کی دنیا بھی بدل جاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں لفظ شیدا فارسی کا لفظ ہے اور اس کے کئی معنی ہیں جو مختلف کیفیات انسانی کے حامل ہیں۔ مثلاً گھبرایا ہوا۔ پریشان' دیوانہ' سٹین گاس نے اس لفظ کے ایک معنی Possessed بھی لکھے ہیں جس کے اردو میں پھر اپنی جگہ کئی معنی ہیں۔ مثلاً ایک تو دیوانہ کی عام معنی ہوئے اس کے علاوہ جذبۂ شوق سے بے حد متاثر ہونے والے کو بھی شیدا کہتے ہیں' پرسکون کو بھی شیدا کہتے ہیں' اپنے نفس پر قادر کو بھی شیدا کہتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شیدائے آل دیوانہ تو ان معنی میں ہوتا ہے کہ آل محمدؐ کی محبت اسے عقل کی عام سطح سے بلند کر دیتی ہے۔ پرسکون اس لئے ہوتا ہے۔ آل محمد کی محبت زندگی کے معنی اس پر روشن کر دیتی ہے۔ اب اسے کسی طرح بھی اپنی زندگی کے بے معنی ہونے کی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ اس کے سکون میں ایک

عجیب قسم کا عزم پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسؔ کے سکون کو ہم منفی انداز میں نہیں کے وہ گھبراتا اس لئے ہے کہ کہیں وہ آل محمد کی محبت میں اپنے فرائض سے غافل نہ ہو جائے۔ یعنی شیدائے آل محمدؐ کی گھبراہٹ ایک طرح کی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ آل محمدؐ کی محبت اس کی ذات میں فرض کے احساس کو ایک اعلیٰ قسم کی ذمہ داری سے لبریز کر دیتی ہے۔ جس میں اپنی جگہ ایک نشہ بھی ہوتا ہے۔ اور اس نشہ کے ساتھ ساتھ ایک شعور بھی جو اس کے اس نشے کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ اور اسی کیفیت کے تحت شیدائے آل کو ہم نہایت اعتماد کے ساتھ قادر علی النفس کہہ سکتے ہیں۔ کہ اپنے نفس پہ اسے قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس طرح شیدائے آل محمد کی ذات اعلیٰ انسانی اقدار کا ایک عمدہ نمونہ بن جاتی ہے۔

اس کے بعد آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شیدائے آل اپنے عمل اور اپنی فکر کے اعتبار سے کس طرح ایک بلند ترین انسانیت کے مقام پر فائز ہو گا۔ اسی لئے شیدائے آل کے بعد مصرع زیر بحث میں میر انیس نے ''شیفتۂ واجب الوجود'' کی معنی خیز ترکیب استعمال کی ہے۔ اس معنی خیز ترکیب کو سمجھانے کے لئے بھی ہمیں اس کے الفاظ کے معنی پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ لفظ شیدا کی طرح لفظ شیفتہ کے پہلے معنی تو دیوانہ ہی کے لغات میں بتائے گئے ہیں۔ لیکن مسٹر شٹین گاس ہی نے اپنی پرشین انگلش ڈکشنری میں شیفتہ کے معنی Enamoured مسحور، دوسرے معنی Strongly inclined مضبوطی کے ساتھ مائل، رجوع، متوجہ اور Astonsished حیران بتائے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص شیدائے آل محمدؐ ہو گا وہ ذات باری تعالیٰ یعنی واجب الوجود کی طرف پوری مائل بھی ہو گا وہ واجب الوجود یعنی جو ذات وجود کے واقعی لائق ہے اسے۔ یعنی شیدائے آل کو مسحور بھی کرے گی۔ اور وہ اس ذات باری تعالیٰ سے ورطۂ حیرت میں ہو گا۔ دوسرے

لفظوں میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں ۔شیدائے آل محمد معرفت ذاتِ الٰہی کے لئے بھی نہ صرف پوری طرح تیار ہو گا بلکہ اس ذات پاک نے اس پر اپنااثر بھی دکھایا ہو گا۔ اس ذات پاک پر شیدائے آل شدت کے ساتھ مائل بھی ہو گا۔ اور ان مراحل کے بعد شیدائے آل محمد عالم حیرت میں بھی آ جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص صحیح معنی میں محبّ اہل بیت ہوتا ہے وہ عاشق الٰہی بھی ہو جاتا ہے۔ اور ظاہر ہے جب وہ عاشق الٰہی ہو جاتا ہے تو پھر اس کے قلب و نگاہ کے حالات بھی یکسر بدل جاتے ہیں۔ وہ ہر طرح کے تعصبات سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ اللہ کے بعد اس کی بیشتر توجہ پوری عالم انسانیت پر ہو جاتی ہے۔ وہ مذاہب کی عام سطحوں سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ اسے مذاہب عالم سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی یا مذاہب عالم کی وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یا اسے دیگر مذاہب بے معنی نظر آتے ہیں۔ وہ دنیا کے تمام مذاہب کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان کا احترام کرتا ہے۔ ان پر محض ایک عالمانہ یا فاضلانہ نگاہ ہی نہیں ڈالتا ان پر ایک عاشقانہ نگاہ ڈالنے کی بھی اس کے دل میں وسعت ہوتی ہے۔

میں جو بار بار میر انیس کے عقیدے کی بات کرتا ہوں' اور اسے وسعت نگاہ سے دیکھنے کی گذارش کرتا ہوں اس سے میری مراد قطعی طور پر کسی خاص گروہ کے عقیدہ کی طرف متوجہ کرنا ہرگز ہرگز نہیں ہے میں تو مذہب کے حوالے سے اور خصوصیت کے ساتھ دین اسلام کے حوالے سے جو ہمارے حتمی مرتبت حضرت محمدؐ عربی نے انسان کے قلب و نگاہ میں ایک خوش نصیب وسعت اور رفعت پیدا کرنے کی سعی فرمائی اور اپنی اس سعی میں اپنی آل اور اصحابؓ پاک کو اپنی تعلیم و تربیت کی بدولت شامل کر کے یہ چاہا ہے کہ دنیا میں انسان اپنے صحیح مقام کو پہنچانے ' اصل میں یہ پہچان اور یہ معرفت میرا مقصد گذارش ہے اور اس معرفت اور پہچان کا یہ

مصرع زیر بحث بہت عمدہ ثبوت ہے۔ شیدائے آل شیفتۂ واجب الوجود۔

اس شیفتۂ واجب الوجود پر ہم ذرا مزید توجہ کرتے ہیں۔ تو ہمیں شاعرانہ کیفیت کے حوالے سے واجب الوجود یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے آموجود ہوا ہے۔ شیفتۂ کا لفظ خصوصیت کے ساتھ ہمیں یہ ٹھوس لیکن ان گنت حسن و جمال سے بھرپور احساس دلاتا ہے۔ اگر وہ یعنی واجب الوجود ہمارے سامنے نہ ہوتا تو ہم اس پر شیفتہ کیسے ہو جاتے۔ ہمارا شیفتہ ہونا ہمارا حیران ہونا ہمارا مسحور ہونا یہ سب اس لئے ہے کہ ہمیں واجب الوجود کا احساس حواس کے ذریعے پوری شدت سے ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ خود واجب الوجود کی معروف ترکیب ہمیں واجب الوجود کا ٹھوس احساس دلا رہی ہے۔ گویا محبِ اہل بیت رسول کوئی عام اور معمولی شخصیت نہیں ہوتی۔ اہل بیت رسول سے محبت کرنے والا بھی بیک وقت عاشق رسول بھی ہوتا ہے، عاشق اہل بیت بھی اور عاشق اللہ بھی۔ آنحضرتؐ نے اپنے اہل بیت کی پرورش اور تعلیم و تربیت اس نہج پر کی تھی کہ ان تمام ہستیوں میں واجب الوجود جیسے سرایت کر گیا تھا۔ اور اس طرح ہم اہل بیت کو نبی آخر الزمان اور اللہ کی ذات سے ایک لمحے کے لئے بھی علیحدہ محسوس نہیں کر سکتے۔ ایسا محسوس کرنا تو الگ بات ہے ہم تو خود حب اہل بیت میں اتنے سرشار ہو جاتے ہیں۔ کہ حب رسول اور حب الہ ہماری ذات میں توحید کی نبض بن کر دھڑکتی محسوس ہوتی ہے۔ یعنی حب اہل بیت حب رسول اور حب الہ یہ تینوں محبتیں ایک ہو جاتی ہیں۔ ان تینوں محبتوں کو الگ الگ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا، خواب اور حباب

(میر انیس کے شعر اور غالب کے شعر کے حوالے سے)

لطف کی بات یہ ہے کہ ایک شعر میر انیس کا ہے اور ایک شعر غالب کا اور ان دونوں شعروں کے مضمون تو جدا جدا ہیں۔لیکن موضوع ایک ہی ہے اور وہ موضوع ہے دنیا۔لیکن ان دونوں شعروں سے میر انیس اور غالب کی طبائع کا بھی پتا چلتا ہے اور اس دنیا کو سمجھنے اور اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی خبر بھی ہمیں ملتی ہے۔ اور پھر سب سے زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ ان دوشعروں سے ہمیں غالب کی شاعرانہ بصیرت اور میر انیس کی شاعرانہ بصیرت سے متعلق بھی بہت کچھ معلوم ہوتا ہے۔ غالب کا شعر تو خاص مشہور ہے۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

لیکن میر انیس کا یہ شعر اتنا مشہور نہیں لیکن پھر بھی اتنا مستور بھی نہیں ہے۔

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں
وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں

واضح ہو کہ میں یہاں غالب اور میر انیس کے ان ہر دو اشعار کا مقابلہ نہیں کر رہا ہوں اور نہ ہی میرا مقصد ان اشعار کی تفہیم و تشریح۔ خاص طور سے غالب کے شعر کی تفہیم تو جب کروں گا اس وقت کروں گا ہی اب تو میں میر انیس کے شعر کے بارے میں کچھ زیادہ بتانا چاہتا ہوں۔ غالب اور میر انیس کے ان دونوں شعروں سے ایک تو غالب اور میر انیس کا عقیدہ ہر چند ایک ہی ہے لیکن ہمارے ان دونوں بڑے شاعروں کی افتادِ طبع کی باعث جو عقیدہ میں نازک سا فرق ہے وہ غور کرنے کی چیز ہے اور دوسری بات ہمارے ان دونوں عظیم شعراء کی شاعرانہ بصیرت ہے جو اس وقت ہمارا موضوع ہے جبکہ ان دونوں شعروں کا موضوع دنیا ہے۔

غالب اپنے شعر میں اپنی افتادِ طبع کے مطابق نہایت فلسفیانہ اور ایک طرح صوفیانہ انداز میں بتا رہے ہیں کہ جناب جس عالم کو جی ہاں ہمارے سامنے والی جس دنیا کو ہم شہود یعنی ظاہر اور سامنے کی چیز سمجھ رہے ہیں دراصل وہ غیب ہے یعنی پوشیدہ اور چھپی ہوئی۔ گویا مرتبۂ احدیت میں ہے جہاں ہماری رسائی ممکن نہیں جس کا ہم ادراک نہیں کر سکتے اور نہ کچھ اسے سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کو صحیح معنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں جو کچھ نظر آ رہا ہے اصل میں وہ نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہی ہے اس لئے ہم جو سمجھتے ہیں کہ ہم جاگتے ہوئے ہیں دراصل وہ ہم خواب میں یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم جاگے ہوئے ہیں اصل میں ہم جاگے ہوئے نہیں خواب ہی میں ہیں۔ دنیا اور اس کائنات کے بارے میں یہ تصور بلند تو کہا جا سکتا ہے لیکن حقیقت کے یہ تصور اتنا قریب نہیں ہے وہی بات کی غالب کی اس تصوری کائنات کا تصور تو کیا جا سکتا ہے اس میں ہمیں معانی کی بھی نو بہ نو موجیں ابھرتی محسوس ہوتی ہیں لیکن اس تصور کو ہم عام زندگی سے قریب نہیں

کہہ سکتے۔ اس کے برعکس میر انیس کے شعر میں حقیقت دنیا کو جس طرح بیان کیا گا ہے وہ ایک تو جلدی سے سمجھ میں آتا ہے اس کے علاوہ اس تصور میں عجب انداز کی گہرائی اور گیرائی ہے۔ میر انیس کے پورے شعر پر ہم اس طرح بات کر سکتے ہیں۔

شعر کے پہلے مصرع میں کہا گیا ہے نمود و بود کو عاقل حباب کہتے ہیں۔ یعنی دنیا میں جو کچھ نمودار ہو رہا ہے سامنے آ رہا ہے اس کی مثال حباب کی سی ہے۔ دنیا کا ایک بلبلے کی طرح تصور سے بھی مختلف ہے اور اس عام شعر کے تصور سے تو قطعی طور پر مختلف نظر آتا ہے۔ آدمی بلبلہ ہے پانی کا۔ یعنی اس تصور میں پانی کے بلبلے سے ذہن آگے نہیں بڑھتا اور اس طرح سے یہ تشبیہ اپنے تاثر کے اعتبار سے اتنی معتبر نہیں ہے۔ لیکن میر انیس کے شعر کے پہلے ہی مصرع کو ہم پڑھتے ہیں۔ نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں۔ تو حباب کی تصویر کچھ عجب انداز سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ زندگی کی نمود و بود کو عاقل یعنی عقلمند لوگ حباب سمجھے ہیں۔ اس مصرع میں ایک تو حباب کی تشبیہ ذرا سنبھل کر ہمارے سامنے آتی ہے پہلے نمود و بود کے الفاظ سے دنیا کا ایک منظر اور وہ بھی ابھرتا اور ڈوبتا ہوا ہمارے سامنے آتا ہے پھر ہم نہیں کہتے عقلمند لوگ اس بود و نمود کو حباب کہہ نہیں رہے اسے حباب سمجھ رہے ہیں یعنی اہل دانش نے حباب کی تشبیہ بڑی سوچ سمجھ کر دی ہے۔ اس کے وجہ سے دنیا کے نمود و بود میں جہاں بے ثباتی کا تصور ابھرتا ہے وہیں حباب کے ٹوٹنے پھوٹنے کے تصور سے ایک عجیب طرح کی چکا چوند بھی ہماری آنکھوں میں اس بے ثباتی دنیا کا ایک حسین سا منظر پیش کرتی ہے۔ دنیا کے نمود و بود کو حباب سے دی گئی تشبیہ ہم پر جہاں بے ثباتی کا تصور واضح کر رہی ہے جہاں اس بے ثباتی کے تصور میں حسن و جمال کی ایک جھلک سی پیدا ہوتی ہے وہاں حباب کی تشبیہ ہمیں

حباب کے آر پار دیکھنے کا موقع بھی عطا کر رہی ہے۔ یعنی دنیا کا بے ثبات ہونا اور ساتھ ہی ساتھ خوبصورت ہونا بہت ہی واضح سی حقیقت ہے اس قدر واضح جس طرح حباب کے وجود میں سے ہم آر پار دیکھ سکتے ہیں۔ اور پھر حباب کی تشبیہ سے ایک اور نکتہ جو ہمارے سامنے اس دنیا کے بارے میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ ہزار دنیا بے ثبات ہے اور ہزار اس کی بے ثباتی واضح ہے لیکن دنیا کی یہ سب چیزیں اور ان کا حسن و جمال کوئی عام سی چیز نہیں بہت ہی نازک سی چیز ہے کہ جس کے ساتھ ہم ایک لمحے کے لئے بھی غفلت نہیں برت سکتے۔

آپ نے غور فرمایا اگر میر انیس یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ دنیا کی نمود و بود ایک حباب کی طرح ہے تو پھر حباب کی تشبیہ میں جو حسن و جمال جو بے ثباتی اور اس کے ساتھ ساتھ نزاکت موجود ہے ہم پر اس کا انکشاف نہ ہوتا۔ میر انیس نے یہ کہہ کر دنیا کی نمود و بود کو عام آدمی نہیں بلکہ عقلمند لوگ حباب سمجھتے ہیں ہمارے ذہن کو حباب کی تشبیہ کے جملہ رموز کی طرف منتقل کر دیا۔ یہ بات صرف اتنی سی بات کہہ دینے سے کہ ہستی اپنے حباب کی سی ہے واضح نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں غور اور توجہ کرنے کی بات یہ ہے کہ میر انیس کی شاعرانہ بصیرت نے کس سادگی کے ساتھ اس دنیا کی بے ثباتی کو بھی واضح کر دیا اور سب سے بڑھ کر لطف کی بات یہ ہے کہ میر انیس نے کوئی نئی تشبیہ استعمال نہیں کی۔ ''آدمی بلبلہ ہے پانی کا'' والی تشبیہ بہت ہی عام سی تشبیہ اگر آپ اسے کہتے ہیں تو میر انیس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرتے۔ لیکن میری گزارش پھر یہی ہے کہ یہاں اس مصرع کی داد اسی وقت پوری طرح ہم دے سکتے ہیں جب ہم یہ تسلیم کریں اور بصمیم قلب تسلیم کریں کہ میر انیس کی شاعرانہ بصیرت ہمارے بڑے بڑے شعرا کی نسبت کہیں زیادہ گہرائی اور گیرائی کی حامل ہے۔ اور حقیقت پسندانہ بھی۔

پہلے مصرع میں حباب کی بات کرکے یعنی یہ کہہ کر کہ دنیا ایک حباب کی طرح ہے اور یہ بات عقلمند لوگوں نے سوچ سمجھ کر کہی ہے۔ہمیں دنیا کی بے ثباتی اور اس کے حسن و جمال کا پورا پورا احساس دلا کر میر انیس نے شعرزیر بحث کے دوسرے مصرع میں بظاہر ایک دوسری بات کہہ دی ہے وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں۔ آیئے ہم میر انیس کا شعرزیر بحث کو پوری طرح اپنے سامنے رکھتے ہیں۔

نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں
وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں

چلئے مانتے ہیں میر انیس نے نمود و بود کہہ کر پوری کائنات کے ظہور کو اپنی گرفت میں لے لیا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں حباب سے کیا تعلق بنتا ہے۔ بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ کوئی تعلق نہیں لیکن ذرا غور کرنے پر پتا چل جاتا ہے کہ میر انیس نے حباب سے خواب کو یا خواب کو حباب سے تشبیہ دے کر صحیح معنی میں ہمیں بتایا ہے کہ شاعرانہ بصیرت کس کو کہتے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے کہ میر انیس کی شاعرانہ بصیرت کے کیا معنی ہیں۔ جس طرح حباب وقوع میں آتا ہے۔ اور ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ اس طرح خواب کا عالم بھی ہوتا ہے۔ ایک منظر سامنے آیا اور وہ ابھی پوری طرح کھل کر سامنے نہیں آنے پایا تھا کہ بلبلے کی طرح بیٹھ گیا۔ اور ایک دوسرے منظر نے بلبلے کی طرح اپنا ظہور فرمایا۔ اس تشبیہ کو دیکھ کر ارسطو کے اس قول کی صداقت یاد آتی ہے کہ تشبیہ کے لئے نئی سے نئی مشابہت تلاش کرنا کسی بڑے ذہن کا کام ہوا کرتا ہے۔ دنیا کا نمود و بود کو حباب کہنا اور پھر اسی حباب کو خواب سے تشبیہ دینا میر انیس کی عظمت ذہن کی دلیل ہے۔

اس کے بعد شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع کی طرف آیئے۔ اور پھر غالب کے شعر کے دوسرے اس مصرع کو بھی ذہن میں رکھیے ہیں"خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب ہیں"۔ غالب اس دنیا کی زندگی کو اس طرح بتا رہے ہیں۔ جیسے کوئی خواب میں جاگ جائے یعنی خواب ہی میں جاگ جانے کا خواب دیکھ رہا ہو۔ تو ایسی صورت میں اس دنیا کی حقیقت ہمارے عام حواس کے لئے الگ سی ہو کر رہ جاتی ہے جبکہ غالب اس شعر کے پہلے مصرع میں صاف صاف کہہ رہے ہیں۔ ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود یعنی دنیا کی جو چیزیں ہمارے سامنے ہیں دراصل وہ اشیاء نہیں ہیں بقول غلام رسول مہر "ذات احدیت غیب کے اندر غیب ہے۔ لیکن اسے ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں۔ اس طرح غالب کا پورا شعر ہماری عام زندگی سے کٹ سا جاتا ہے۔ جبکہ میر انیس کا دوسرا مصرع بہت واضح ہے۔ وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں۔ دنیا کو خواب سمجھنا اور خواب کے اندر جاگنے کا خواب دیکھنا ایک طرح بالکل دو متضاد صورتیں ہیں۔ میر انیس کا دوسرا مصرع جس طرح ہمیں اپنی زندگی کا بھرپور احساس بھی دلاتا ہے۔ اور پھر اسے خواب سمجھتا ہے ہمیں اس زندگی پر پوری توجہ بھی دلانے کا موجب بن رہا ہے۔ یعنی ہم جاگے ہوئے ضرور ہیں لیکن ہمیں اپنے جاگنے کو اس طرح سمجھنا چاہئے جیسے ہمارا یہ جاگنا ایک خواب ہے ہم اس دنیا میں آنکھیں کھول کر خواب دیکھ رہے ہیں یعنی اپنی طرح طرح کے خواہشات کا اظہار کر رہے ہیں۔ جنکی تکمیل ہم دوسری زندگی میں پہنچ کر کریں گے۔ زندگی کو خواب سمجھنا زندگی کے تسلسل کی خبر دے رہا ہے۔ ہماری اس توقع کو واضح کر رہا ہے کہ ہماری زندگی صرف اسی دنیا تک محدود نہیں ہے بلکہ ہماری یہاں کی زندگی کے سلسلے بہت دراز نہیں جو ابد میں جا کر ہی پوری ہونگے۔ اس طرح غالب کا یہ مصرع" ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں"

ہمارے قدم آگے نہیں بڑھاتا بس ہم اپنی جگہ ہیں اور عملی طور پر ناکارہ یہ بات میر انیس کے زیر بحث شعر کے مصرع میں قطعی طور پر نہیں پائی جاتی۔ وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں کا مطلب یہ ہے کہ جاگنے والے طرح طرح کی خواہشات رکھتے ہیں اور ان کو پوری خواہشات کے بارے میں یہ بھی معلوم ہے کہ اس دنیا میں سے تمام خواہشات پوری ہونے والی نہیں لیکن ہم اس دنیا میں ان خواہشات کے لئے اس طرح کے کام کر سکتے ہیں جن کی وجہ سے اگلی دنیا میں ان کی تکمیل ہو سکے گی۔

میر انیس کے شعرزیر بحث کے عملی پہلو کے علاوہ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انیس کا یہ شعر ہماری جمالیاتی حس کو بھی بیدار کر رہا ہے۔ ہر خواہش کے ساتھ ایک جمالیاتی اظہار وابستہ ہے۔ کوئی نہ کوئی جمالی پہلو ہماری ہر خواہش کے ساتھ جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے کیونکہ اگر کسی خواہش میں کوئی جمالیاتی رخ نہیں ہے تو سمجھئے وہ خواہش انسانی اقدار سے بڑی حد تک دور ہے۔ اس حد تک کہ ہم اپنی اس خواہش سے خوف زدہ ہو سکتے ہیں۔ اوّل تو شعر زیر بحث کے پہلے مصرع میں ہی جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے نمود و بود کو حباب کہہ کر ایک جمالی پہلو کو اجاگر کر دیا ہے۔ گویا اس دنیا کو آپ کتنا بھی بے ثبات کہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے اس دنیا کی بے ثباتی میں جو ایک حسن پایا جاتا ہے اس کا بھی کوئی جواب نہیں۔ ہمیں یہ دنیا جس قدر بے ثبات نظر آئے گی اسی تناسب سے اس میں حسن پایا جاتا ہے۔ اس کے رنگا رنگ پہلو زیادہ نظر آئیں گے ایک طرح سے بے ثباتی دنیا ہمارے ذوقِ جمال کو مہمیز کرتی ہے کہ دیکھو غور سے دیکھو کہاں غفلت میں مبتلا ہو کیوں آنکھیں بند کر کے زندگی گذار رہے ہو۔ آنکھیں کھولو گے تو تمہیں اس چند روزہ زندگی کا حسن و جمال مزید زندہ رہنے کے لئے اکسائے گا لیکن اس کا یہ

اکسانا بے معنی نہیں ہے۔ اس چند روزہ زندگی کا حسن و جمال اس حقیقت امر کی طرف واضح اشارہ ہے کہ زندگی چند روزہ نہیں ہے۔ اس کا سلسلہ اس دنیا تک محدود نہیں ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ہمیں اس دنیا کی ایک جھلک دکھا کر پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سلا دے۔ اس دنیائے بے ثبات کے لحاتی جلوے لحاتی نہیں بلکہ ہمیں بتاتے ہیں کہ حسن و جمال کا سلسلہ اس قدر چند روزہ کیسے ہو سکتا ہے یہ تو بہت ہی ہلکا سا جلوہ ہے تا کہ آپ جلوۂ جاوید کے لئے اپنے آپ کو تیار کر سکیں۔

آخر میں میر انیس کا شعر جو سب سے بڑی مشکِ معنی ہماری طرف پھینک رہا ہے وہ یہ ہے کہ بے ثباتی دنیا کو ثبات کا ایک جلوہ سمجھنا اور یہ سب عرفان ومعرفت انسان کے عقیدہ کی بدولت ہے۔ عقیدہ انسان کے پاؤں حقیقت حیات کی سرزمین پر مضبوطی کے ساتھ جمانے کا کام کرتا ہے۔ عقیدہ ایک اعتبار حیات ہے جو انسان کو بہت سی فضول باتوں سے جن کا زندگی کے ساتھ فی الحقیقت کوئی رشتہ نہیں ہوتا لیکن ہم اپنی ناسمجھی کے باعث فضول رشتوں یا خیالی رشتوں کو بھی حقیقی رشتے سمجھنے لگتے ہیں۔ لاریب کہ غالب کی حقیقت پسندی اپنی مثال آپ ہے میں اس ضمن میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور ابھی اور بہت کچھ لکھوں گا لیکن مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میر انیس اپنے شعر زیر بحث میں جس انداز کی حقیقت پسندی کو واضح کر رہے ہیں وہ غالب کے شعر میں ہرگز ہرگز موجود نہیں ہے۔ وہی بات کہ خواب میں جاگنا یعنی خواب میں یہ محسوس کرنا کہ جاگ گئے ہیں۔ قطعی طور پر اس طرح کا جاگنا نہیں ہے اور نہ اس طرح کا خواب دیکھنا ہے جو میر انیس نے اپنے شعر زیر بحث میں بات کی ہے اور معنی خواب اور معنی بیداری کے فرق کو نہ صرف ہم پر واضح کیا ہے بلکہ ہمیں راستہ دکھایا ہے کہ زندگی خواب اور بیداری کو

سامنے رکھ کر کس طرح گذارنے کی ضرورت ہے۔ وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں۔ میر انیس کے اس مصرع کا خواب اور بیداری کے ضمن میں کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ اسی طرح ہم لوگ لڑکپن سے یہ مصرع سنتے آئے ہیں۔ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ یہ مصرع بھی میرانیس کے بلیغ مصرع کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ عام مصرع دنیا کی زندگی کیلئے بے ثبات ہونے کو تو ظاہر کر رہا ہے لیکن یہ بے ثباتی اس مصرع پر آ کر رک سی جاتی ہے جبکہ میر انیس کے اول تو پورے شعر میں ورنہ خواب اور بیداری کے حوالے سے دوسرے مصرع میں بے ثباتی کا عالم ہمیں اپنے تک محدود نہیں رکھتا۔ ہم اپنے خواب اور اپنی بیداری کو لے کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اور پھر ہمیں اپنے اس بڑھنے کی بھی کوئی انتہا نظر نہیں آتی۔

ویسے اگر آپ صحیح معنی میں آگے بڑھتے ہوئے کسی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو کربلا والوں کی طرف آیئے اور پھر دیکھئے وہ کس طرح بیدار تھے۔ اور کس طرح اس دنیا کو خواب سمجھتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس کی بہترین مثالیں مراثی انیس میں آپ کو جگہ جگہ مل سکتی ہیں۔ میں خوفِ طوالت سے مثالیں پیش نہیں کر رہا ہوں۔ امام حسین کربلا میں پہنچے ہیں۔ تو غور فرمایئے دنیا کو خواب سمجھنے والے لوگ اپنے مقتل میں کسی طرح داخل ہوتے ہیں۔ میر انیس کے ایک مرثیے کا آغاز اس بند سے ہوتا ہے۔

جب دشتِ مصیبت میں علی کا پسر آیا منزل کی طرف لے کے ستارے قمر آیا
گردوں سے فزوں اوج زمیں کا نظر آیا تھا شور کے دریائے شرف کا گہر آیا
خنداں ہوئے جوں گل سفری راہ خدا کے
فردوس کی بو آگئی جھونکوں سے ہوا کے

آپ نے میر انیس کے ایک مرثیہ کے آغاز کا بند ملاحظہ فرمایا۔ اب اسی بند کے تحت میر انیس کی شاعرانہ بصیرت پر غور فرمایئے کہ وہ کس طرح دنیا کو خواب سمجھنے والے افراد کی نفسیات کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں کیا خوب فرماتے ہیں۔ کہ "جب دشتِ معصیبت میں علی کا پسر آیا" تو ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دشت مصیبت بھی آکر وہ پریشانی کا اظہار کرتا لیکن چونکہ علی کا پسر تھا یعنی امام حسین ان اعلیٰ افراد میں سے تھے جن کو دنیا اپنے حرص وہواس میں مبتلا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے جب امام نے دیکھا کہ وہ دشت مصیبت یعنی کربلا میں پہنچ گئے ہیں۔ تو انہیں ایک طرح کا اطمیان اور حوصلہ ہوا کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں یا یوں سمجھ لیجئے کہ عقبیٰ کی منزل ان کے قریب آ گئی ہے۔ کربلا میں وہ اور ان کے رفقا شہید کر دیئے جائیں گے۔ اس طرح وہ کامیاب و کامران ہو جائیں گے کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کو اللہ کی راہ میں ایک مقصد عظیم کی خاطر قربان کر دیا۔ لہٰذا جیسے ہی وہ اپنی قتل گاہ میں پہنچے ان کی ذوات کے پیکر نور مقصد سے جگمگانے لگے اور امام حسین چونکہ ان کے سالار تھے۔ وہ قمر نظر آرہے تھے اور ان کے ساتھی ستارے معلوم ہو رہے تھے۔ انیسؔ تیسرے مصرع میں کیا خوب فرماتے ہیں۔" گردوں سے فزوں اوج زمیں کا نظر آیا" یعنی زمین کربلا ان روشن افراد کی آمد سے آسمان سے بھی بلند ہو گئی تھی۔ گویا زمین و آسمان کی عظمت کا پتا اس وقت چلتا ہے جب ان میں کوئی بڑی ہستی ظہور کرتی ہے۔ یہاں خوبصورت نکتہ یہ ہے کہ ویسے تو زمین بھی آسمان ہی کا حصہ ہوتی ہے لیکن بلند مرتبہ لوگوں کا وجود اسے آسمان سے اس لئے بلند کر دیتا ہے کہ یہ بلند مرتبہ لوگ زمین پر ہوتے ہیں۔ اور آسمان ان کو حسرت سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اور زمین پر یعنی اس کی خاک پر رشک کر رہا ہوتا ہے۔ چوتھے مصرع میں سے بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ کربلا کی

زمین پر امام حسین کی آمد سے ایک شور ایک غلغلہ بلند ہوا کہ اس قدر بڑا آدمی اس پر موجود ہے جس کی شرافت کو سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جی ہاں دریائے شرف کے موتی کو کوئی گہر شناس ہی سمجھ سکتا ہے عام آدمی کو اس کی عظمت کا کیسے اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس بند کے چھٹے مصرع میں میر انیس فرماتے ہیں۔ ''خنداں ہوئے جوں گل سفری راہِ خدا کے'' راہ خدا کے مسافر پھول کے طرح مسکرا رہے تھے۔ اس لئے کہ ان کا خواب اپنی تعبیر کے قریب پہنچ رہا تھا۔ انہوں نے جو دنیا کو خواب سمجھا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اللہ انہیں ایسا موقع عطا فرمائے کہ وہ اس کی راہ میں قربان ہو جائیں چنانچہ ان کے قربان ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اور ان کے عقیدہ کی شدت کا یہ حال تھا کہ انہیں اس وقت چلتی ہوئی ہوا سے فردوس کی خوشبو آ رہی تھی ۔ یہاں ایک اور نکتہ واضح ہو رہا ہے کہ عقیدہ ایسی مضبوط اور بھروسے کی چیز ہوتی ہے۔ کہ وہ انسان کو اس کے آئڈیل اور مثال سے قریب کر دیتا ہے۔ جس طرح کربلا شہداء کو کربلا میں پہنچ کر یہ احساسِ مسرت فزوں ہو رہا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے آئیڈیل کے بہت ہی قریب پہنچ گئے ہیں اور اس قربت کا کمال یہ ہے کہ عام ہوا کے جھونکوں میں انہیں فردوس کی خوشبو آ رہی ہے۔ اور وہ اپنے آپ میں پھولے نہیں سما رہے ہیں۔

ناقدریٔ عالم............

(میر انیس کی ایک بیت کے پیش نظر)

میر انیس اپنے ایک مشہور مرثیہ "یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر" کی ایک بیت میں عجیب بات کہہ گئے جس کا براہ راست تعلق ناقدریٔ عالم سے ہے۔ شاعری کیا کسی بھی فن کے خالق کے لئے اس کی تخلیقات کی تعریف و قدر دانی بہت ضروری ہے۔ اس تعریف و قدر دانی سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ فن کار کا دل بڑھتا ہے اور یوں اس کا فن بھی فروغ پاتا ہے۔ قدر دانی نہ کی جائے تو فن کار کا دل ٹوٹتا ہے اور ظاہر ہے دل ٹوٹتا ہے تو فن بھی تخلیق نہیں ہوتا۔ یا فن کی تخلیق میں بہت سے رخنے پیدا ہو سکتے ہیں۔ جو فن کے مقصد کو فوت کر دیتے ہیں۔ لیکن میر انیس نے ناقدری کے ان منفی اثرات سے بچنے کے لئے میرے خیال میں رواداری میں ایک پتے کی بات کہہ دی ہے جو اپنی جگہ بڑی حد تک مضبوط ہے۔ میر انیس کی بیت ملاحظہ فرمائیے۔

ناقدریٔ عالم کی شکایت نہیں مولا
کچھ دفترِ باطل کی حقیقت نہیں مولا

اس بیت کا پہلا مصرع سن کر تو یہی احساس ہوتا ہے کہ شاعر فی الحقیقت ناقدری عالم کی شکایت ہی کر رہا ہے۔ لیکن دوسرے مصرع کو سن کر فوراً پتا چلتا ہے کہ شاعر ناقدریٔ عالم کی واقعی شکایت نہیں کر رہا ہے بلکہ اپنی شکایت نہ کرنے سے متعلق بہت عمدہ اور ٹھوس دلیل پیش کر رہا ہے۔ دفتر کے معنی حسابات اور تخمینے اور اندازے کے ہیں اور باطل' ناچیز' اور بے حقیقت کو کہتے ہیں ۔ تو اس طرح انیس نے قدر نہ کرنے والوں کے اندازے کو بے حقیقت اور کم وقعت یعنی ناچیز قرار دیا ہے۔ اگر کوئی آپ کے کام کی قدر نہیں کر رہا ہے تو اس سے آپ کو بے دل یا بے حوصلہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اصل میں خرابی آپ کے کام کی نہیں ہے یا آپ کے کام میں نہیں اصل خرابی غلط اندازہ لگانے والے ناقدر دانوں کے ذہن کی ہے۔ لہٰذا ناقدری عالم سے انسان کو مایوس یا بددل نہیں ہونا چاہئے۔

بغور دیکھا جائے تو ناقدری کی شکایت کرنا اپنے ذہن کی کمزوری کو واضح کرتا ہے اگر آپ کو اس طرح ناقدری عالم کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ ناقدری کوئی معنی نہیں رکھتی تو آپ اپنی جگہ ذہنی طور پر مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ناقدر دان لوگوں کی شکایت کسی معنی کی حامل نہیں رہ جاتی۔ اگر آج آپ کے کام کی ناقدری ہو رہی ہے تو کل کو قدر بھی ہو جائے گی بلکہ قدر دانی ایک لازمی چیز ہے۔ وہ تو ایک نہ ایک دن ضرور ہوتی ہے۔ البتہ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر کسی کام کی قدر دانی نہیں ہو رہی ہے۔ تو کام کرنے والے کو تو نقصان پہنچ رہا ہے اس کے اس نقصان کا ازالہ کس طرح ممکن ہے۔ عجیب لطف کی بات یہ ہے کہ میر انیس شعر زیر بحث میں اس نقصان کے ازالے کی بھی ہمیں ایک صورت بتا رہے ہیں۔ اور وہ صورت یہی ہے کہ ناقدری کی شکایت کرنے کی بجائے ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے کام کی اہمیت کو اپنے زمانے کے لوگوں پر واضح کریں۔ شکایت

کرنے کا ایک سب سے بڑا نقصان یہ بھی ہوتا ہے خود شکایت کرنے والے کی طاقت خواہ مخواہ خرچ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس شکایت کرنے سے یہ بات کہیں بہتر ہے کہ ہم اپنے قدر دانوں کو تلاش کریں اس، میں کوئی شک نہیں کہ قدر دانوں کی تلاش کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں ۔لیکن قدر دانوں کو تلاش کرنا شکایت کرنے سے ہزار درجے بہتر کام ہے۔ اصل میں جس زمانے میں ہم قدر دانوں کی تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ یا اس تلاش کی فکر میں ہوتے ہیں ہم ایک انداز میں اپنے کام پر بھی نظر ثانی کر رہے ہوتے ہیں۔ اور اس طرح ہمارا کام آگے بڑھ رہا ہوتا ہے۔ مگر ہمارے کام کا آگے بڑھنا بھی کوئی معمولی کام نہیں رہ جاتا اس سے نہ صرف ہمارے کام کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ خود ہماری اہمیت میں بھی اضافہ ہو رہا ہوتا ہے۔

ویسے ناقدری عالم نہ تو کوئی آج کا موضوع ہے اور نہ اس پر غور وفکر سے کوئی عقلمند آدمی منع کر سکتا ہے۔ آج تک دنیا میں جتنے بھی ایسے رونما ہوئے ان میں کسی نہ کسی طرح ناقدری عالم کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ اگر آدمی آدمی کی قدر کرتا رہے تو بے شمار معاشرتی بیماریوں کا چشم زدن میں علاج ممکن ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے جیسے جیسے ایک آدمی دوسرے آدمی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے ویسے ویسے گوناگوں معاشرتی برائیاں ختم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ صاف ستھرے معاشرے کی تخلیق میں بھی اور اس کو قائم رکھنے میں بھی انسان کا قدر دان ہونا بنیادی معنی رکھتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو سارے ظلم وستم کی جڑ بھی ناقدری میں پوشیدہ ہے۔ آدمی کسی بھی ظلم وستم سے پہلے وہ کسی ناقدری کا شکار ہوتا ہے۔ قدر دان شخص اور خواہ کچھ ہو جائے وہ ظالم کبھی نہیں ہو سکتا۔ قدر دانی کا تو مطلب ہر چیز کو اس کی اصل جگہ پر دیکھنا ہے۔ گویا قدردانی سے بڑھ کر عدل کو فروغ دینے

والی بھی کوئی دوسری قدر نہیں ہو سکتی۔

میر انیس نے بیت زیر بحث کے دوسرے مصرع میں ناقدری کو جس طرح صفر کیا ہے اس کی داد بھی دیئے بغیر نہیں رہا جاتا۔ کس سادگی خوبصورتی اور روانی سے میر انیس فرما رہے ہیں۔ کچھ دفتر باطل کی حقیقت نہیں مولا یہاں مولا کا لفظ بھی اپنی معانی کی پوری پوری چھوٹ دے رہا ہے۔ سوچنے کی بات ہے جب ایک چیز ہے ہی دفتر باطل میں سے تو پھر اس کی حقیقت کیا اور اس کا وجود کیا۔ مولا کے لفظ سے کہنے والے کو جو ایک مورل سپورٹ مل رہی ہے اس کا بھی کوئی جواب نہیں۔ ایسی صورت میں کوئی ناقدری عالم کی شکایت کیا کر سکتا ہے۔ اسے تو الٹا ناقدریٔ عالم ایک اپنے ہی انداز کا حوصلہ بخش رہی ہے۔

ناقدریٔ عالم کی سب سے بڑی اور درد ناک مثال محمدؐ اور آل محمدؐ کی ذواتِ مقدسہ ہیں جنہوں نے پورے عالم انسانیت اور مسلم امہ کی ہمیشہ سلامتی چاہی لیکن مسلم امہ نے انہیں سمجھنے میں ہمیشہ ٹھوکر کھائی۔ ویسے بظاہر مسلم امہ نے ہمیشہ آل محمد کو عزت کی نگاہ سے دیکھا لیکن چونکہ جو آل محمد نے چاہا اسے کبھی نہیں سمجھا گیا یہ ایک ایسا سینۂ عالم میں ناسور ہے جس کا اندمال اسی وقت ممکن ہے۔ جب مسلم اُمہ محمد و آل محمدؐ کی بات کو سمجھ لے۔ ایک عجیب طرح کا حجاب ہے جو درمیان میں حائل ہے۔

وہ سرِّ زندگی ہیں محمدؐ کی اہل بیت
جن کو زمانہ جان سکا کم بہت ہی کم

یاد

لیکن بیت زیر بحث کی تفہیم محمدؐ و آل محمدؐ کے حوالے سے کچھ اور ہی طریقے سے ظہور میں آتی ہے۔ محمد و آل محمد ناقدریٔ عالم کی شکایت کرنے کے

بجائے وہ تو مسلسل دعائیں طلب کرتے ہیں۔ اور دیتے ہیں۔ یعنی جب مسلم امہ محمد و آل محمد کونہیں سمجھتی تو محمد و آل محمد امت کے لئے دعا مانگتے ہیں یا رب تو ان پر رحم فرما انہیں عقل دے کہ یہ سوچیں اور غور کریں کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ اور یوں بیت زیر بحث کے دوسرے مصرع 'کچھ دفتر باطل کی حقیقت نہیں مولاؑ' کا مطلب یہ نہیں بنتا کہ اگر امت ناقدری کر رہی ہے تو اس ناقدری کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ محمد و آل محمد صحیح معنی میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس ناقدری کی حقیقت کا نہیں بلکہ محمد و آل محمدؑ صحیح معنی میں حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس ناقدری کی حقیقت کو اس کے نقصان کو تسلیم کرتے ہوئے اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ امت مسلمہ اپنی ناسمجھی کو تسلیم کرے اور غور و فکر سے کام لے کر محمد و آل محمد کی صحیح معنی میں قدر دان ہو جائے۔ امت' محمد و آل محمد کی قدر دانی کرے گی تو اس کے بگڑے ہوئے نصیب سنور جائیں گے۔

میر انیس نے اپنی زیر بحث بیت میں جس طرح عام مفہوم اور خاص مفہوم کو سمویا ہے اس کی بھی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ انیس نے اپنے عقیدت مندی کو بھی قائم رکھا ہے۔ اور حقیقت پسندی کو بھی کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ بیت کے دونوں مصرع اپنی اپنی جگہ پر جوں کے توں قائم ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں لیکن ذرا غور سے کام لینے پر عام مفہوم کو بھی احاطہ میں لے لیا گیا ہے اور خاص مفہوم بھی ذرا توجہ دینے سے افق ذہن پر ابھر آتا ہے۔ عام آدمی تو بہت حوصلہ دکھاتا ہے تو ناقدریٔ عالم کی شکایت نہ کرنے ہی کو اپنی بہت بڑی بلند اخلاقی سمجھ کر دل ہی دل میں فخر محسوس کرتا ہے لیکن خدا کے خاص بندے آل محمدؑ ناقدریٔ عالم کی نہ صرف شکایت نہیں کرتے وہ تو الٹے ناقدری کرنے والوں کے حق میں دعائیں کرتے ہیں۔ اور یوں دعا کے حوالے سے وہ ناقدری کرنے والوں کی

اہمیت کو بھی سامنے لے آتے ہیں۔ جس کا مظاہرہ عام لوگ تو تصور میں نہیں کر سکتے۔ یعنی عام آدمی تو یہی سوچتا ہے کہ جب کوئی ہماری قدر نہیں کرتا۔ تو ہم ایسے شخص کو کیوں خاطر میں لائیں' ہم اس کی پرواہ کیوں کریں۔ ناقدری کرنے والے شخص کے لئے تو عام آدمی کے دل سے بددعائیں ہی نکلتی ہیں۔ لیکن میر انیس کی بصیرت ملاحظہ فرمایئے کہ انہوں نے آل محمدؐ کی اس ادا کو کس طرح سمجھا کہ ان کا کوئی مرثیہ بھی مسلم امہ کے لئے آل محمد کی طرف سے دعاؤں سے خالی نہیں ہے۔ ہر مرثیے میں شہدائے کربلا کا ہر کردار خواہ وہ چھوٹا یا بڑا ہے' مسلم امہ کے لئے کسی نہ کسی انداز میں دعا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یا اس سے بھی آگے کی بات کہ وہ امت کی بھلائی کے لئے اپنے آپ کو راہ خدا میں قربان کر رہا ہوتا ہے۔

غرض انسانی نفسیات کے دونوں پہلوؤں یعنی منفی اور مثبت کو سامنے رکھ کر بات کہنا انسانی نفسیات کے امکانات کو واضح کرتا ہے۔ یعنی یہ بھی ایک حقیقت کہ جب کوئی شخص آپ کی کسی خوبی کا اعتراف یا احترام نہیں کرتا تو اس کی اس ناقدری پر آپ کو غصہ آتا ہے۔ آپ اس کے لئے بد دعا بھی کر سکتے ہیں اس کے حق میں برا بھی چاہ سکتے ہیں۔ اور یہ آپ کی طرف سے کوئی زیادتی شمار نہیں کی جا سکتی۔ قرآن پاک کے چھٹے پارے کا آغاز ہی اس بات سے ہوتا ہے کہ ٹھیک ہے اللہ کو یہ بات پسند نہیں۔ کہ آپ کسی کو برا کہیں لیکن جس پر ظلم ہوا ہے اس شخص کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اور چونکہ ناقدری بھی ایک طرح کا ظلم ہے لہٰذا ناقدری پر جس کی ناقدری کی گئی ہے وہ ناقدری کرنے والے کو برا کہہ سکتا ہے۔ لیکن دیکھ لیجئے وہ لوگ کتنے بلند حوصلہ ہوتے ہیں جو ناقدری پر برا کہنا تو بڑی بات ہے بلکہ ناقدری کرنے والے کے حق میں دعا کرتے ہیں۔ دراصل ایسے لوگ اس لئے بلند نظر ہو جاتے ہیں کہ انہیں انسان کی اصل فطرت کے مثبت پہلوؤں پر یقین ہوتا

ہے وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک انسان نے ایک اچھی بات کو آج نہیں سمجھا تو وہ اس بات کو کل سمجھ لے گا یا سمجھ سکتا ہے۔ انسان کی ذات سے یہ امید یہ توقع انسانیت کے حق میں بڑے معنی رکھتی ہے۔ اور اس وقت یہ توقع اور یہ امید اور بھی با معنی ہو جاتی ہے۔ جب کسی قوم کو ہمارے آنحضرتؐ جیسا جلیل القدر ہادی اور رحمت اللعالمین راہنما میسر آیا ہو۔ اور آل محمد بھی اسی توقع پر ہمیشہ مسلم امہ کے لئے دعا کرتے رہے۔

آل نبیؐ نے مسلم امہ کی ناقدری کی اس لئے بھی شکایت نہیں کی کہ ناقدری کا دائرہ کبھی وسیع نہیں ہوتا۔مثلاً کوئی زید کی ناقدری کرتا ہے تو اس ناقدری کا تعلق آپ کی اپنی ذات سے ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ جو شخص زید کی ناقدری کر رہا ہے کل کو زید کی قدردانی بھی کرنا شروع کر دے۔ ناقدری کا دائرہ زیادہ سے زیادہ کسی ایک قوم تک پھیل سکتا ہے جیسا کہ امام حسین کے وقت میں یزید اور اس کے اسلاف کے غلط پروپیگنڈے نے آل محمد کے خلاف لوگوں کی بے خبری سے فائدہ اٹھا کر انہیں بھڑکایا اور بعد میں یہ سلسلہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن آل محمد کی نگاہ میں چونکہ پورا عالم انسانیت تھا اس لئے وہ اس ناقدری سے مایوس نہیں ہوئے۔ اور مسلمانوں کے ظلم وستم کے باوجود ان کے حق میں دعا کرتے رہے۔کسی کے لئے دعا کرنا دراصل اس شخص کی قوت ذہن وقوتِ عمل کے لئے دعا کرنے کے مترادف ہے۔آپ جس کے لئے دعا کرتے ہیں۔ وہ آپ کی طرف ہی متوجہ نہیں ہوتا اپنے رویے اور اخلاق کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے۔ اور یوں وہ اپنے آپ کو تمام کا تمام بدل ڈالے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

آبرومندی کا تسلسل

میر انیس کی غزل کا ایک شعر

میرا خیال ہے میں سب سے پہلے وہ شعر آپ کے سامنے پیش کروں جس پر مجھے گفتگو کرنی ہے وہ شعر یہ ہے ملاحظہ فرمائیے۔ اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے غزل کا شعر ہے۔

تمام خلق ہے خواہانِ آبرو یارب
چھپا مجھے صدفِ قبر میں گہر کی طرح

مجھے یہ شعر مضمون کے اعتبار سے تو کوئی خاص نظر نہیں آیا کہ موت کی دعا مانگنا کہاں کی عقلمندی ہے لیکن اس شعر پر ذرا غور کرتے ہیں۔ تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ اس میں موت کی دعا نہیں مانگی جا رہی ہے موت تو جب آئے گی تب آئے گی لیکن موت جب بھی آئے شاندار طریقے سے آئے۔ مرنا تو برحق ہے لیکن کس طرح مرنا ہے جیسا کہ میں نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں بتایا ہے کہ یہ بڑی حد تک انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ کس طرح مرے یا اسے موت کس طرح آئے مزید یہ کہ اس شعر میں تشبیہ و استعارے کی ندرت نے موت کو ایک بہت ہی

باوقار چیز بنا کر رکھ دیا ہے۔

شعر زیر بحث کے پہلے مصرع میں خلق خدا کی ایک خاص خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔ یعنی اس دنیا میں جو چیز بھی ہے اپنی ایک شناخت ایک چمک دمک اور ایک عزت و آبرو چاہتی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ہر چیز کو اپنے ہونے کا احساس ہے ۔ یا ہر چیز کے ہونے کا کوئی مقصد ہے۔ دنیا کی کوئی چیز بے مقصد نہیں۔معانی اور مطالب ہر چیز کی ہستی میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ ان معانی اور مطالب کا پتا اسی وقت چلتا ہے یا چل سکتا ہے جب وہ چیز نمایاں ہوکر ہمارے سامنے آئے۔ نمایاں ہونے کا اختیار ہر چیز کو ایک حد تک ہے لیکن پوری طرح نمایاں ہونے کے لئے ہر چیز کا اپنے خالق کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا ضروری ہے۔ اور رابطہ قائم رکھنے کے لئے سب سے بڑا ذریعہ دعا ہے' خواہش ہے' بغور دیکھا جائے تو ہماری ہر خواہش ایک طرح دعا ہوا کرتی ہے۔لیکن شعر زیر بحث میں دعا کے ساتھ شاعر ایک دلیل بھی دے رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ اے پالنے والے کسی ایک چیز کی بات نہیں تیری ساری دنیا اپنی ایک عزت اور آبرو کی آرزومند ہے۔ مخلوقاتِ عالم کی کوئی چیز بے آبرو ہو کر رہنا پسند نہیں کرتی۔ کیونکہ بے آبرو رہنا یا بے آبرو ہونا ایک طرح بے مقصد ہو جانے کی بات ہے۔ پھر عزت اور آبرو کے ساتھ ہی ہونے کا بھی کچھ پتہ چلتا ہے۔

اور جب دنیا کی ہر چیز آبرو سے رہنا چاہتی ہے تو اے پالنے والے میں تو تیرا بندہ ہوں۔ میرے لئے تو عزت و آبرو کا خاص اہتمام ہونا چاہئے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تو نے مجھے مجبور محض پیدا کیا ہے۔یقیناً آبرو سے رہنے کے لئے خود مجھے تگ و دو کرنی چاہئے۔ لیکن اے پالنے والے آبرو سے رہنا صرف میری ہی خواہش نہیں تیری کائنات کا ذرہ ذرہ آبرو مند رہنا چاہتا ہے۔ اس طرح

دیکھا جائے تو آبرو سے رہنا زندگی کی یا ہونے کی ایک بنیادی خواہش ہے۔ للہذا اس بنیادی خواہش میں جب تک تیری رضا تیری امداد شامل حال نہ ہوگی کچھ بات نہیں بنے گی۔ اصل میں خدا کی طرف رجوع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عزت و آبرو کو قائم رکھنے کی جس قدر ایک بندے میں صلاحیت موجود ہے وہ صلاحیت پوری طرح بروئے کار آجائے۔ اور اے پالنے والے جب تو نے آبرو مندی کو وجود کی ایک بنیادی آرزو قرار دیا ہے تو پھر اس ضمن میں ہماری مدد فرما اور تیرا مدد فرمانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ جب تیری ذات اس قدر بلند و بالا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تو تیری مخلوق کس طرح بے آبرو ہو سکتی ہے۔ تیری مخلوق کا تیری ذات سے تعلق ہی اتنا بڑا اعزاز ہے کہ کسی شئے کے لئے بھی بے آبرو ہونے کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ للہذا جب کائنات کی ایک عام شئے کے ساتھ ہم کسی بے آبروئی کا کوئی تصور قائم نہیں کر سکتے۔ تو اے پالنے والے جو تیری مخلوق میں اشرف ترین ہستی انسان ہے اس کو بے آبرو ہوتے کیسے تصور کر سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انسان کو کچھ اختیار بھی دیا گیا ہے لیکن اس اختیار کو استعمال کرنے کی توفیق بھی تو ہی عطا کرتا ہے۔

اس طرح شعر زیر بحث میں پہلے مصرعے کے حوالے سے عزت و آبرو کا ایک تصور دے کر شاعر دوسرے مصرع میں کہہ رہا ہے کہ اس کی تمام زندگی بھی اے پالنے والے عزت و آبرو سے گذرے اور جب اسے موت آئے تو وہ قبر میں اس طرح جائے جس طرح صدف میں موتی ہوتا ہے۔ شعر زیر بحث میں مرنے کے لئے دعا نہیں کی گئی بلکہ ایک آبرو مند اور عزت والی موت کی دعا کی گئی ہے۔ مرنا تو برحق ہے لیکن آدمی کا مرنا آبرو مندی کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اور عزت و آبرو سے مرنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی قبر میں جاتا ہے۔ تو اس طرح جاتا ہے جس

طرح ایک موتی اپنی سیپی میں ہوتا ہے۔ قبر کو صدف کہنا اور لاش کو گہر اس تشبیہ اور استعارے نے قبر کے تصور کو بھی ایک عجیب رفعت بخشی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عزت و آبرو بھی، اسی طرح انسان کی لاش کو بھی موتی کہہ کر اس کی عزت و آبرو کی لاج ہی نہیں رکھی، انسانی لاش کو پوری چمک دمک سے بھی نوازا ہے۔ مرنے کے فطری عمل کو ایک ایسا حسن و جمال بخشا ہے جس کی ہم پوری طرح داد بھی نہیں دے سکتے۔ ایک دفعہ تو صدفِ قبر کا تصور انسان کو دہشت قبر سے فوراً نکال کر چمکیلے موتی کی صورت میں سامنے لے آتا ہے۔ ممکن ہے سرسری نگاہ سے اگر ہم اس تشبیہ و استعارے کو دیکھیں تو کوئی خاص بات نظر نہ آئے لیکن ذرا توجہ سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ قبر اور اپنی لاش کے تصور سے عموماً آدمی خوف زدہ ہی رہتا ہے لیکن یہاں صدف و گہر کے استعارے نے اس خوف زدگی کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے اور پہلے مصرع میں جو کہا گیا ہے کہ تمام خلق ہے خواہانِ آبرو یا رب اس سے یہ احساس ہوتا ہے۔ جیسے مرنے کا تمام فطری عمل اپنے اندر ایک خوبصورتی بھی رکھتا ہے بشرطیکہ مرنے والا بھی اپنی اس آبرومندی کے خیال سے جگمگانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں شعر زیر بحث کا مضمون تو موت سے متعلق ہے جیسا کہ میں نے ابتداء ہی میں عرض کر دیا ہے لیکن انیس نے موت کے اس مضمون کو ہمارے عام شعراء کی طرح بیان نہیں کیا۔ موت کے مضمون کو انیس نے جس رکھ رکھاؤ کے ساتھ بیان کیا ہے اس کا احساس ہمیں اسی وقت ہوتا ہے جب ہم موت کے اس مضمون کو اپنے دور کے شعرا کے ہاں دیکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر؟

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے نہیں آتی

یا اسی غزل میں غالب کا یہ مشہور شعر دیکھ لیجئے۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی ۔

غالب کا پہلا شعر ''مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی'' خواہ کتنا بھی اچھا ہو لیکن اس میں انیس کے شعر والا لطف پیدا نہیں ہو رہا ہے مرنے کی آرزو میں مرنا بظاہر تکلف کے علاوہ اور کوئی خاص بات نظر نہیں آتی ۔ اور نہ ہی موت پر کوئی خاص روشنی پڑتی ہے۔ موت آتی ہے پر نہیں آتی یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اس مصرع سے بھی ایک انداز کا تکلف نمایاں ہوتا ہے۔ موت کے مضمون کے ساتھ تکلف کسی طرح بھی جچتا نہیں ہے۔ دوسرے شعر میں چلئے موت کے بارے میں ایک اٹل بات کا تو پتا چلا کہ موت کا ایک دن معین ہے لیکن دوسرا مصرع ایک سوال اٹھا رہا ہے کہ جب موت کا ایک دن معین ہے تو رات بھر نیند کا نہ آنا کیا معنی رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غالب کی ایک ہی غزل کے یہ دونوں شعر ہیں دونوں کا مضمون بھی ایک ہے۔ پہلے شعر میں موت سے گلا گذاری ہو رہی ہے کہ بھئی یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ہم تمہاری آمد کے لئے بے چین ہیں لیکن آپ ہیں کے آتی ہی نہیں ہیں۔ دوسرے شعر میں موت کو اٹل کہہ کر غالب نیند کی طرف متوجہ ہو گئے اور کہنے لگے موت تو جب آئے گی۔ آئے گی نیند حسب معمول کیوں نہیں آرہی ہے۔

لیکن ان دونوں اشعار غالب کے برعکس میر انیس کا شعر زیر بحث کا مضمون موت ہے تو موت کے بارے میں بڑی بنیادی اور عمدہ باتیں کہی گئی ہیں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ جس طرح زندگی سے عزت اور آبرو کا ایک مضبوط تعلق ہے اسی طرح موت کے ساتھ بھی عزت اور آبرو کا تعلق ہے۔ یعنی یہ کوئی بات نہیں کہ

آدمی کی زندگی تو عزت و آبرو سے گزرے لیکن موت کے وقت آدمی بے آبرو ہو جائے۔ اول تو ایسا ہو گا ہی نہیں' عزت و آبرو کی زندگی ایک طرح آدمی کی آبرو مند موت کی بھی ضامن ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی ناسمجھ آدمی کسی آبرو مند شخص کی موت کو نہ سمجھ سکے تو ایک نہ ایک وقت آدمی کی باعزت زندگی کے واقعات ناسمجھ آدمی کے لئے بھی آبرو مندی کو قابل فہم بنا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ میر انیس تو شعر زیر بحث میں اپنے رب سے دعا کر رہے ہیں کہ اے پالنے والے صرف میری زندگی ہی عزت کے ساتھ نہ گزرے میری موت بھی آبرو مند ثابت ہو اور میں قبر میں اس طرح جاؤں جس طرح ایک موتی ایک گہر صدف میں ہوتا ہے۔ چھپا مجھے صدف قبر میں گہر کی طرح۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ قبر کو صدف اور اپنے جسم کو گہر کہہ کر شاعر نے زندگی اور موت دونوں کو ایک خاص آبرو مندی کی فضا سے فیض یاب کر دیا ہے اور موت کے مضمون میں شاعر نے واقعی آب و تاب پیدا کر دی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ جب آدمی کو موت ہی آ گئی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ عزت کے ساتھ مرتا ہے یا بے عزتی کے ساتھ تو یہی وہ مقام ہے جہاں سے ہمیں میر انیس کے عقیدے کی مضبوطی اور علویت کا پتا چلتا ہے میر انیس کو اپنے عقیدے پر پورا پورا یقین ہے کہ ان کی زندگی صرف اس دنیا تک محدود نہیں اس دنیاوی زندگی کا سلسلہ آگے بھی چلتا ہے۔ حالانکہ اسی خیال اور مضمون کا میر تقی میر کا شعر بہت واضح اور مشہور ہے۔

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میر کا شعر بہت واضح ہے لیکن اتنا عمدہ نہیں ہے جتنا کہ میر انیس کا شعر عمدہ ہے۔ میر انیس کے شعر عمدہ ہے۔ میر انیس کے شعر زیر بحث کے معنی بھی یہی

کہ زندگی موت پر ختم نہیں ہوتی اس کا سلسلہ دراز ہے لیکن میر انیس نے موت کو ماندگی کا وقفہ نہیں کہا۔ بلکہ ایک استراحت کا وقفہ کہا ہے اور وہ اس طرح کہ اگر کوئی موتی اپنی سیپی میں چھپا ہوا ہے تو اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ اس موتی کو ایک وقت میں باہر آنا ہے۔ اور پھر وہ نمودار ہوگا تو اس کے وجود کے مقصد کا بھی مزید پتا چلے گا۔ اور پھر شاعر نے اپنی آبرو مندی کی خواہش کو اپنے پالنے کی خدمت میں پیش کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زندگی کی عزت و آبرو کا کوئی ٹھکانہ ہے یہ تو زندگی کے خالق کی منشا پر ہے کہ وہ زندگی کے اس موتی کو کس کس کام کے قابل بناتا ہے۔ بغور دیکھا جائے تو میر انیس نے زندگی کی آبرو مندی کو صرف موت تک ہی ختم نہیں کیا اس زندگی کے سلسلہ آبرو کو بہت آگے تک پہنچنے کے امکانات کو واضح کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں بھی موت سے متعلق اشعار کے ضمن میں فانی بدایونی کے اشعار کا حوالہ دیا ہے تاکہ ہمیں پتا چلے کہ انیس نے موت کے مضمون کو شعر زیر بحث میں کس انوکھے انداز میں باندھا ہے فانی کا مندرجہ ذیل شعر بہت مشہور ہے۔

ادا سے آڑ میں خنجر کی منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

آپ فانی کے اس شعر کو موت کے مضمون کے ضمن میں کتنا بھی شوخ اور خوبصورت کہہ لیجئے لیکن آپ فانی کے اس شعر کو میر انیس کے شعر زیر بحث کی طرح وقیع نہیں کہہ سکتے بے شک فانی کے اس شعر میں ایک خاص قسم کی شوخی ہے اور محاکات بھی لیکن وہی بات کہ فانی کے اس شعر میں وہ وقار اور وجاہت نہیں جو میر انیس کے شعر زیر بحث میں ہے۔ ایک عجیب انداز کے دل افروز اور دیدہ زیب

متانت ہے جو میر انیس کے شعر کو ایک علیحدہ ہی قسم کا مقام معنی عطا کر رہی ہے۔

موت کے بارے میں فانی کا ایک اور مشہور شعر ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

آ گئی ہے ترے بیمار کے رخ پر رونق
جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

بہت عمدہ شعر ہے اور مزید لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں امر واقعہ کا بھی ذکر ہے۔ عموماً جب آدمی مرتا ہے تو زندگی کی گوناگوں پریشانیوں کی وجہ سے جو پہلے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہوتے ہیں۔ وہاں مرنے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔ ہم زندہ لوگوں کو ایسا لگتا ہے جیسے مرنے والا اپنی موت سے مطمئن ہے۔ فانی نے اپنے شعر میں ''ترے بیمار'' یعنی محبوب کا بیمار کہہ کر ایک لطف پیدا کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مجموعی اعتبار سے اگر ہم اس شعر کے معنی پر غور کرتے ہیں۔ تو ہمیں یوں لگتا ہے جیسے موت آنے پر آدمی کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ آگے عقبیٰ وغیرہ کا تصور محض ایک تصور کے علاوہ اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ گویا یہ شعر اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود زندگی کے تسلسل کا غماز نہیں ہے۔ جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارمان نکلا۔ اور ارمان نکلا تو گویا اس ارمان کا خاتمہ ہو گیا۔

کہا جا سکتا ہے کہ میں نے فانی کے شعر ہی اس طرح کے کوٹ کئے ہیں جو زیادہ دقیع نہیں ہیں یا سنجیدہ نہیں ہیں تو لیجئے دوسری قسم کا شعر حاضر کر رہا ہوں۔ فانی فرماتے ہیں۔

موت ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آسان نہ تھی
زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا

اس شعر میں بھی فانی موت اور زندگی دونوں ہی کو ایک تہمت اور الزام کہہ رہے ہیں۔ گویا نہ موت ان کے لئے کوئی معنی رکھتی ہے اور نہ زندگی۔ اور اگر

کوی معنی رکھتی ہے تو وہی بات کہ موت تہمت کی شکل میں اور زندگی الزام کی صورت میں چلئے فانی کا ایک اور شعر پیش کر رہا ہوں۔

ہے موت ہی اک زندگی دل کا سہارا
جینے کی جو ایسی ہی تمنا ہے تو مر جا

یہاں بھی فانی موت کو زندگی دل کا سہارا فرما رہے ہیں اسی لئے اپنی رائے دے رہے ہیں کہ اے دوست تجھے جینے کی ایسی ہی تمنا ہے تو اس کے لئے پہلے مرنا سیکھ۔ وہی بات کہ فانی کو اپنی جگہ زندگی کا مکمل کوئی احساس نہیں ہے۔ آدمی کو زندگی کا پورا پورا احساس ہو تو اس کے لئے موت کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی اور اگر موت کی کوئی خاص اہمیت ہے بھی تو وہ بھی صرف زندگی کے حوالے سے ویسے میں نے فانی کے اشعار اور اسی طرح غالب کے اشعار کو یہاں پیش کرنے میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جو اشعار میرے سامنے آتے چلے گئے میں یہاں لکھتا چلا گیا۔ ہوسکتا ہے فانی اور غالب کے ہاں میر انیس کے شعر زیر بحث کے مقابلے کے اشعار موجود ہوں۔

میں یہاں شعر مندرجہ ذیل کو پھر لکھتا ہوں تا کہ اس پر مزید بحث کرنے کے لئے اس شعر کا تمام پیکر ہمارے سامنے رہے۔

تمام خلق ہے خواہانِ آبرو یارب
چھپا مجھے صدف قبر میں گہر کی طرح

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے میر انیس کا یہ شعر ان کی ایک غزل کا شعر ہے ۔ اس کا موضوع اصل میں زندگی ہے اور ذیلی موضوع موت ہے۔ اس شعر میں بات دراصل زندگی پر ہو رہی ہے اور اگر موت پر کوئی بات ہو رہی تو زندگی کے حوالے سے یعنی آدمی مر جاتا ہے تو ضروری نہیں کہ اسے زمین کھا جائے یا ختم

کر دے۔ ایک امکانی صورت یہ بھی ہے کہ زمین آدمی کی لاش کو اس طرح حفاظت کے ساتھ رکھے جس طرح صدف یا سیپی میں کوئی موتی ہوتا ہے۔ اب چونکہ زمین کی یہ خوبی عام نہیں اس لئے پالنے والے سے درخواست کی جا رہی ہے کہ جب تو نے اپنے مخلوق میں یہ خواہش پیدا کر دی ہے کہ وہ آبرومندی سے قائم دائم رہے تو اے رب اے پالنے والے مجھے بھی یہ عزت و آبرو عطا فرما اور صرف اس زندگی تک ہی نہیں بلکہ جب میں مروں تو میری ہستی کو یہ زمین اس طرح قبول کرے جس طرح ایک صدف گوہر کو قبول کرتی ہے۔ کیونکہ مجھے اس حقیقت پر پورا پورا یقین ہے کہ تیری بخشی ہوئی ہے زندگی کوئی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہونے والی چیز نہیں۔ اس میں دوام کی خوبو اور خصائل پائے جاتے ہیں۔ بس آدمی اگر ذرا خیال رکھے تو اسے دوام کی زندگی نصیب ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے اسے یعنی آدمی کی زندگی کے بارے میں اپنا زاویۂ نگاہ بدلنے کی ضرورت ہے۔ اور وہ زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کو چند روزہ نہ سمجھے۔ اس میں جو دوام کی خواہشات پائی جاتی ہیں وہ تمام کی تمام اس امر واقعی کی غمازی کر رہی ہیں کہ انسان کی زندگی اتنی تھوڑی ہرگز ہرگز نہیں جتنی تھوڑی کہ بظاہر وہ نظر آتی ہے۔

شعرِ انیس میں صبر و شکر کے نئے نئے پہلو

حقیقت یہ ہے کہ مراثیٔ انیس کو سامنے رکھ کر آپ انیس کی شاعرانہ بصیرت کی داد دینے بیٹھ جائیں تو یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہونے پائے۔ قدم قدم پر آپ کو شاعرانہ بصیرت ایسے گل معنی کھلاتی نظر آتی ہے۔ کہ آپ کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ ظاہر ہے حیرت بڑھتی ہے تو معانی کے قدم بھی آگے بڑھتے ہیں۔ اور ایک مقام ایسا آتا ہے کہ آپ کو حیرت اور معنی میں تفریق کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔ میں ویسے ہی مراثیٔ انیس کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ایک بیت پر آ کر نگاہ ٹھہر گئی۔ امام عالی مقام کو دشمن فرات کے کنارے سے خیمے دور لگانے کے لئے کہہ رہے ہیں اور حضرتِ عباس کو غصہ آ رہا ہے اس گرمی میں فرات کے کنارے سے خیمے دور لگانے کا مطلب یہ ہے کہ لق و دق صحرا میں خیمے لگا دیئے جائیں۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی اس پر امام حسینؑ حضرت عباس کو سمجھاتے ہوئے فرما رہے ہیں۔

کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے؟
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے!

آپ نے ملاحظہ فرمایا اس بیت میں میر انیس صبر و شکر کا ایک نیا اور انوکھا تصور دے رہے ہیں۔ جس میں وسعت اپنی جگہ ہے اور اس وسعت کی وجہ سے اور اس وسیع تشبیہ کے باعث ایک ٹھوس حقیقت۔ الگ اپنی جگہ ہمارے سامنے آرہی ہے۔ جی ہاں صبر و شکر کی حقیقت امام حسینؑ حضرت عباسؑ سے فرما رہے ہیں۔ اے میرے بہادر بھائی اگر دشمن ہمارے خیموں کو دریا کے کنارے سے دور لے جا کر صحرا میں نصب کرنے کو کہہ رہے ہیں تو اس میں ہمیں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ دریا کے کنارے کے منظر میں وہ وسعت کہاں ہے جو ہمیں صحرا کے منظر میں نصیب ہو گی۔ گویا میر انیس امامِ عالی مقام کی زبانی صبر و شکر کے معنی سمجھا رہے ہیں۔ یہاں سب سے بڑا نکتہ غور کرنے کا یہ ہے کہ ہم اس دنیا کو اس کائنات کو اس کائنات کے چار سو کو کچھ بھی سمجھتے رہیں۔ یہی دنیا یہی کائنات ہمارے اندر کی وسعتوں کا پتا ہمارے لئے فراہم کرتی ہے ایک صبر کرنے والے اور ایک شکر کرنے والے شخص کو جب اسے اپنے سامنے لق و دق صحرا نظر آرہا ہو۔ تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے صبر میں اس کے شکر میں اس صحرا سے کہیں زیادہ وسعتیں موجود ہیں۔ صبر کے ایک معنی ڈھارس کے بھی ہیں۔ ایک معنی حوصلے کے بھی ہیں یعنی صبر کے معنی بڑے فعال قسم کے ہیں۔ یہ جو صبر کا عام مفہوم لیا جاتا ہے۔ خاموش ہو جانا۔ چپ ہو جانا' یا ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا' صبر کے یہ معنی ہرگز ہرگز نہیں ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے صبر کے معنی تو صورتِ حال پر غور کرکے اس پر قابو پانے کے ہیں۔ اور یہی معنی میر انیسؔ شعر زیرِ بحث میں ہم تک پہنچانا چاہتے ہیں لیکن میر انیس کا کمال یہ ہے کہ صبر و شکر کے معنی ہم پر منکشف ہو رہے ہیں۔ اور منکشف بھی اس طرح ہو رہے ہیں۔ جیسے ہم پر کوئی دن طلوع ہو رہا ہو۔ تشبیہ و استعارہ کا آپ جانتے ہیں سب سے بڑا کمال یہی تو ہے کہ اس کے ذریعہ ہم پر ہر مجرد معنی ٹھوس

ہو کر وارد ہوتا ہے۔ اور ہمارے قلب ونظر کو سرسبز و شاداب کر جاتا ہے۔ بیت زیر بحث کے پہلے مصرع میں امام حسین کی طرف سے ایک بہت ہی مختصر سا سوال کیا جا رہا ہے جس قدر یہ سوال لفظوں کے اعتبار سے مختصر ہے اس اعتبار سے معنی کے حوالے سے یہ سوال بہت طویل و عریض اور وسیع ہونے کی خبر ہمیں دے رہا ہے۔ امام حسین پوچھ رہے ہیں کیا دشت کم ہے؟ صابر و شاکر کے واسطے مطلب یہ ہے کہ صبر و شکر کرنے والے لوگوں کے سامنے اگر صحرا کی وسعت ہے تو سمجھ لیجئے ان کے صبر و شکر کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ یہ کائنات اور اس کائنات کی اشیاء اپنی تمام تر وسعتوں فراخی کے باوصف ہمارے باطن کو اپنی بساط سے بڑھ کر وسعتوں کا احساس دلاتی ہیں۔ اصل میں یہ کائنات کا وجود ہی ہمارے وجود کے امکانات کی بے پایانی کو ظاہر کرنے کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔ گویا امام عالی مقام فرما رہے ہیں عباس غور تو کرو اگر ہمارے خیمے دریا پر رہتے تو ہم اپنے مادی اجسام کو تو ضرور پانی سے سیراب کرتے رہتے۔ لیکن ہمارے روحوں کے لئے حوصلہ اور صبر دکھانے کا اتنا موقع کہاں نصیب ہوتا جو اب ہمیں دریا سے دور ہو کر اور صحرا کے دل میں اتر کر نصیب ہو سکا ہے۔ اور ہو گا۔

وہی بات کہ یوں دیکھا جائے تو میر انیس کے نظریے کے مطابق صحرا میں خیموں کا نصب ہونا کائنات کی وسعتوں میں آجانے کے مترادف ہے۔ اس کائنات کو جی ہاں اس مادی کائنات کو انسان کس طرح اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتا ہے انسان کو اس قوت تسخیر کا کس خوبصورتی اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ ہمیں پتا چلتا ہے۔ یہ بھی زیر بحث بیت کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ میر انیس کی شاعرانہ بصیرت میر انیس کے مراثی میں ہمارے قلب ونظر کو جس طرح فیض یاب کرتی ہے اور جس فراوانی کے ساتھ شاداب کرتی ہے اس کی مثال بھی ہمیں اور شاعری

میں دوسری جگہ مشکل سے نظر آتی ہے۔

پھر اس بیت زیر بحث کے دوسرے مصرع میں تو امام عالی مقام کے عجز و انکسار کی بلندیوں نے ہمارے ذہن کو اس بلندی پر پہنچانے کا موقع فراہم کیا ہے جس کی ہم عام زندگی میں بہت کم توقع کرتے ہیں۔امام مظلوم فرما رہے ہیں'' یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے'' یعنی اگر ہمارے خیمے دریا کے کنارے سے ہٹ کر صحرا میں آجاتے ہیں تو گویا یہ قدرت کی طرف سے ہمارے لئے وسعت حیات کو مشاہدہ کرنے کا اہتمام ہوا ہے۔ ہم نے اپنی مرضی کے مطابق جس میں نفسانی خواہشات کا عمل دخل زیادہ تھا۔ اپنے خیموں کو دریا کے کنارے نصب کرنا چاہا تھا۔ لیکن قدرت ہمیں نفسانی طور پر نہیں روحانی طور پر بلند و بالا دیکھنے کی متمنی ہے اس لئے ہمارے لئے اس نے صحرا تجویز کیا۔ چنانچہ قدرت کے اس انتخاب پر ہمیں ایک طرح خوش ہونا چاہئے کہ قدرت نے ہمارے لئے اتنی وسعتوں کا اہتمام کیا ہے جبکہ ہم حالت مسافرت میں ہیں۔

صورت حال کو قدرت کی طرف موڑ دینا یعنی یہ صرف سمجھنا ہی نہیں اس پر یقین بھی کرنا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حقیقت' عظمیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے اسے ہم کسی قسم کا گریز نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ سچ پوچھیئے اس میں تو اپنے آپ کو انسان اپنی صورت حال کے لئے صحیح معنی میں سوچنے سمجھنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ آدمی جب بھی اپنے منفی حالات کو قدرت کی طرف منتقل کرتا ہے۔ تو اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ ہم اپنی اس صورت حال کو پورے خلوص اور جوانمردی کے ساتھ اپنی زندگی کا حصہ بنانا چاہتے ہیں۔یعنی اس منفی صورت حال کا مقابلہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ اپنے جملہ وسائل کو بروئے کار لانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنی صورت حال کو معمولی نہیں سمجھا اس صورت حال سے پورا پورا مستفید ہونا

ہمارا حق ہے۔ اور ہم ایسا کر کے دکھائیں گے۔ سمجھدار لوگ کبھی کسی صورت حال کو خواہ مخواہ' حقیقت عظمیٰ کی طرف نہیں موڑا کرتے ۔ یعنی غیرت مند اشخاص کو اپنی داڑھی اتنی عزیز ہوتی ہے کہ وہ اسے اللہ میاں کے ہاتھ میں بھی دینا پسند نہیں کرتے۔ اور آپ جانتے ہیں اللہ میاں بھی یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ کسی کی ڈاڑھی کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ یہ نہ اللہ کی شانِ ربوبیت ہے اور نہ شانِ رحمانیت انسان کی آزادی پر معاذ اللہ حملہ آور ہونا حقیقت عظمیٰ کو کس طرح پسند آ سکتا ہے۔

قدرت کی طرف سے بخشی ہوئی آزادی کو انسان کہاں تک استعمال کرتا ہے اس کی مثال بھی ہمیں جیسی سانحۂ کربلا میں نظر آتی ہے۔ وہ بے مثال ہے۔ اور آزادیٔ انسان کو انسان کی بھلائی کے لئے استعمال کرنے کا اگر دنیا میں کہیں بڑے سے بڑا مظاہرہ ہوا ہے۔ تو وہ بھی میدان کربلا ہی میں ہوا ہے جہاں شہدائے کربلا نے انسانی آزادی کو استعمال کرنے کا حق ادا کر دیا۔ میر انیس نے بیت زیر بحث میں آزادی انسان کو آن بان کے ساتھ استعمال کرنے کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی ہے۔ ورنہ اس بیت پر کیا منحصر ہے تمام مراثی انیس اس بات کا بین ثبوت ہیں۔ کہ جس طرح شہدائے کربلا نے اللہ کی عطا کردہ آزادی کو استعمال کر کے دکھایا۔ ایسی مثالیں پورے عالم انسانیت میں ہمیں اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ آزادیٔ انسان سے میری مراد انسان کا اختیار ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں اسی بیت زیر بحث میں دیکھ لیجئے حضرت امام حسینؑ اپنے اختیار کو کس بلند حوصلگی کے ساتھ استعمال فرما رہے ہیں۔ بظاہر ہمیں یوں نظر آتا ہے۔ اور حقیقتاً ہمیں غلط نظر نہیں آ رہا کہ دشمن امام حسین کے قافلے کو کنارِ فرات سے اٹھا رہے ہیں۔ حالانکہ جب امام مظلوم کا قافلہ پہلے کربلا میں پہنچا تھا تو اس کا حق تھا کہ وہ فرات کے کنارے ٹھہرا رہتا لیکن دشمن اپنی کثرت کے زعم اور امام مظلوم کے قافلہ کو کنار فرات سے

دور لے جانے کے لئے مجبور کر رہا ہے حضرت عباس اپنی شجاعت اور صداقت کی بنا پر کنارہ فرات سے خیمے دور لے جانے کو تیار نہیں ہیں لیکن حسین کس عمدگی سے بھائی کو مجبور کر رہے ہیں کہ کوئی بات نہیں خیمے کنار فرات سے دور نصب کر لو کیوں؟ اس لئے کہ دشمن ہمارا حوصلہ آزمانا چاہتا ہے تو آزمالے۔ ہم اس طرح جھک جانے والے لوگ نہیں ہیں۔ کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حوصلے بلند ہوں تو باہر کی دنیا کتنی بھی چھوٹی ہو انسان کے اندر کا حوصلہ اس چھوٹی دنیا کو بھی بڑا کر کے دیکھتا اور دکھاتا ہے باہر کی دنیا کے زمان و مکان اپنی جگہ کتنے بھی وسیع یا کتنے بھی تنگ ہوں ان کی وسعت اور ان کی تنگی کو انسان کا باطن اپنے مطابق ڈھال لیتا ہے۔

اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ باہر کی دنیا باہر کے زمان و مکاں انسان کے باطن کے پابند ہیں اور ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ انسان کے باطن کا کمال یہی تو ہے کہ وہ باہر کی دنیا کی حیثیت کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اپنے زاویۂ نگاہ سے باہر کی دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق کام میں بھی لے آتا ہے۔ یزید کا لشکر امام عالی مقام پر باہر کی دنیا تنگ کر رہا ہے۔ لیکن امام عالی مقام نے یہ کہہ کر کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے باہر کی تنگ دنیا کے سب اطراف کی دیواریں توڑ ڈالیں۔ اگر آدمی کا باطن مضبوط ہے تو باہر کی تنگی اور فراخی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے اور انسان کے اختیار کا پتہ چلتا ہے۔ اور پھر یہ اختیار ہمیں اپنے ظاہر و باطن کی نئی نئی جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔ جی ہاں محمدؐ و آل محمدؐ پر ایمان لانے کی نئی نئی جہتوں سے آشنائی کا عرفان جس کو ہر ذی شعور مسلمان صدق دل سے قبول کرتا ہے۔

ارتقا۔ انسان کی ایک ہمہ وقتی مصروفیت

(میر انیس کے ایک مشہور شعر کے حوالے سے)

شبیہ امامِ زماں کھینچتے ہیں
تصور میں تصویرِ جاں کھینچتے ہیں

سلامِ انیس کے اس مطلع میں بظاہر فاعل غائب ہے لیکن جتنا بظاہر یہ فاعل غائب ہے اسی نسبت سے یہ فاعل حاضر بھی ہے۔ امامِ زماں کی شبیہ کون کھینچ رہا ہے؟ اسی طرح کون ہے جو اپنے تصور میں اپنی جان کی تصویر بنانے میں مصروف ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ فاعل ''ہم'' ہیں جی ہاں ہم بنی نوع انسان لیکن چلئے زیادہ نہ سہی تھوڑی دیر کے لئے تو ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ فاعل ''ہم'' کو پورے عالم انسانیت پر آخر کس واسطے اور کیوں پھیلایا جائے۔ صاف صاف کیوں نہ کہہ دیا جائے کہ صاحب جو لوگ امامِ زماں کے قائل ہیں یہ ان کا کہنا ہے اور یہ انہیں لوگوں کی مصروفیت ہے کہ امامِ زماں کی شبیہ کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ سب محض ایک عقیدہ سے بڑھ کر کچھ نہیں۔

ذرا غور کرنے سے پہلی بات جو فوراً سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ فاعل

''ہم'' کو غائب کرنے ہی سے اس فاعل کو وسعت ملی ہے اور مل رہی ہے۔ اور یہ فاعل ''ہم'' کسی ایک گروہ یا جماعت سے وابستہ نہیں ہے اور ہم اسے وابستہ کر بھی نہیں سکتے۔ اول تو امام زماں کی ترکیب ہی اس فاعل ''ہم'' کی وسعتوں کی پوری طرح شاہد ہے' خواہ یہ ترکیب کسی خاص گروہ ہی نے کیوں نہ بنائی ہو۔ وہ گروہ خود امام کو اپنے تک محدود نہیں کرنا چاہتا۔ وہ تو اسے پورے زمانے کا امام او راہبر تسلیم کر رہا ہے۔ پھر ہم کون ہوتے ہیں۔ جو اس امام کو صرف ایک گروہ تک محدود کردیں۔ ابھی تک انسانی نفسیات کے اس پہلو پر ذرا بھی توجہ نہیں دی گئی کہ جب کوئی ایک فرد بشر یا چند افراد کا مجموعہ اپنی کسی چیز کو سب کی چیز قرار دے رہا ہوتا ہے تو وہ کس قدر ایثار سے کام لے رہا ہوتا ہے اور کس قدر اس میں اس کی اپنی انا کام کر رہی ہوتی ہے۔ بظاہر تو اس وسعت میں ایثار سے زیادہ انا کارفرما نظر آتی ہے۔ کہ اگر کوئی گروہ اپنے امام اپنے راہبر کو سب کا راہبر قرار دیتا ہے تو وہ فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ دیکھا یہ ہمارا امام ہے جو تمام دنیا کا امام بھی ہے لیکن ذرا غور سے سمجھا جائے تو جلدی ہی پتا چل جاتا ہے کہ اپنے امام کو اپنے راہبر کو ساری دنیا کا امام کہنا تو آسان ہے لیکن یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ اس امام میں ایسی خوبیاں اور صفات موجود ہیں جس کی بنا پر اسے سارے زمانے کا امام قرار دیا جا سکتا ہے اور اس طرح قرار دینا ایک بہت بڑی صداقت اور سچائی کا اعلان کرنے کے مترادف ہے۔

لیکن ان جملہ گذارشات سے بھی آگے کی بات یہ ہے اور یہ بات بھی سب سے آگے کی بات اسی لئے ہے کہ شعر زیر بحث میں فاعل غائب ہے۔ فاعل کا غائب ہونا انسانی نفسیات کے ایک بہت ہی شدید اور گہرے احوال کی نشاندہی کرتا ہے اور وہ احوال یہ ہے کہ انسان اپنے راہنما کو اپنے امام کو دیکھنے کا متمنی

ہے۔ اپنے امام اپنے راہنما کو دیکھ لینے کی منزل پر پہنچنے کے بعد اس کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ یہ تو ایک بالکل جداگانہ نوعیت کی صورت حال ہے اسے یعنی انسان کو تو امام کے دیکھنے کی تمنا ہی نے عجیب شدت کار سے سرگرم دیدار کر رکھا ہے۔ لیکن یہ تمنا بھی اپنی جگہ کوئی معمولی صورتِ حال نہیں ہے حالانکہ یہ صورت حال یقیناً معمولی ہے کہ انسان اس صورت حال کے بغیر ایک لحہ بھی نہیں گزار سکتا۔ اور پھر مزید لطف کی بات یہ ہے کہ اپنے امام اپنے راہبر کی تمنا سے ایک بہت معمولی انسان کا دل بھی خالی نہیں ہوتا۔ کسی نہ کسی صورت میں یہ تمنا اس کے دل میں بھی جاگزیں رہتی ہے۔ اور یوں ایک عام انسان بھی عالم تشبیہ اور عالم تنزیہہ کے حوصلہ افزا جھولے میں جھولتا رہتا ہے میں شعر زیر بحث کو پھر لکھ رہا ہوں۔

شبیہہ امام زماں کھینچتے ہیں
تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں

اپنے امام کی اپنے راہبر کی شبیہ کھینچنے کے عمل میں خود کو مصروف رکھنا ایک بہت ہی دلربا اور دلدار قسم کی مصروفیت ہے۔ دلربا یوں کہ اس مصروفیت کے عالم میں آدمی کو اپنی بشری تقاضوں سے خواہ کچھ دیر کے لئے ہی سہی نجات مل جاتی ہے۔ وہ اس وقت خود کو عالم تشبیہ سے عالم تنزیہہ کی طرف لے جا رہا ہوتا ہے۔ مگر اس کی فطری ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے عین اسی وقت وہ اپنے امام اپنے راہنما کو عالم تنزیہہ سے عالم تشبیہہ میں لا رہا ہوتا ہے۔ شبیہ امام زماں کھینچنے کا اس کے علاوہ اور کیا مطلب اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ مگر اس عمل کا یہی تو وہ پہلو ہے جس کو ہم نہایت آرام کے ساتھ دلدار پہلو کہہ سکتے ہیں۔ اس عمل میں آدمی کی دلداری تو واقعی بہت ہو رہی ہوتی ہے کہ شبیہ امام زماں کھینچتے وقت اسے ایک لمحے کے لئے بھی تو مایوسی کا یہ احساس بے مایہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے امام کی شبیہ نہیں کھینچ سکے

گا۔اسے خواہ لاشعوری طور پر ہی سہی اپنے زور تخیل پر پورا پورا اعتماد ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک وقت اس کے امام کی شبیہ سے اس کے نگاہ و قلب شاداب ہو جائیں گے۔ غالبًا اسی وجہ سے خواص کی نسبت عوام اپنے امام زمانہ کی زیارت سے زیادہ مشرف ہوتے رہتے ہیں۔ اب یہ میں اور آپ کیا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ خواص کے مقابلے میں عوام کس قدر روحانی اعتبار سے سرسبز و شاداب اور کامیاب و کامران رہتے ہیں۔ اور خواص و عوام کی نظر میں اپنی اپنی کامیابی اور کامرانی کا معیار کیا ہے۔

کمالِ لطف کی بات یہی ہے کہ انہیں نے امامِ زماں کی شبیہ کھینچنے کے اس نازک اور حیات پرور کام میں کیا عوام اور کیا خواص سبھی کو شامل کر لیا اور یوں یہ واضح طور پر سارے انسانوں کی خواہش معلوم ہو رہی ہے کہ وہ شبیہ امام زماں کھینچنے میں دل و جان سے مصروف ہیں۔ اس آفاق گیر انسانی عقیدہ میں صرف احترام ہی نہیں اپنے پورے شعور کے ساتھ اس کی محبت بھی شامل ہے۔ ہمیں اپنے راہبر اپنے راہنمااور امام کا ظاہر ہے احترام تو اس لئے ہوتا ہے۔ کہ وہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اس سے ہمیں محبت اس لئے ہو جاتی ہے کہ وہ قدم قدم پر ہماری راہنمائی اس خلوص کے ساتھ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ کہ ہمیں اکثر اپنی بات اور امام کی بات میں کوئی بعد نظر نہیں آتا۔ آپ کا سچا راہبر سچا راہنما وہ ہوتا ہے جو آپ کو اپنی قربت کا مسلسل احساس دلاتا رہتا ہے۔ اور پھر یہ تو واقعی بہت ہی نازک بات ہے کہ امام آپ کو اپنی جان کی طرح محسوس ہونے لگے۔ غور کیجئے میں نے جان سے زیادہ عزیز نہیں کہا۔ کیوں؟ اس لئے کہ جان سے زیادہ عزیز کہنے میں ہزار خلوص کے باوجود ایک تصنع آجاتا ہے۔ بس امام اور ہمارا راہبر تو ہماری جان ہوتا ہے کہ جان سے بڑھ کر اس دنیا میں ہمیں کوئی چیز عزیز نہیں ہوتی۔

اس شعر زیر بحث کے پہلے مصرع میں جس طرح امام کو عالم تنزیہہ سے عالم تشبیہ میں لانے کا ایک خوبصورت عمل جاری ہے اسی طرح دوسرے مصرع میں عالم تشبیہ سے عالم تنزیہہ کی طرف ہمارا سفر بھی جاری ہے جی ہاں اور یہ دونوں مشغلے بیک وقت جاری ہیں۔ امام کی شبیہہ کھینچ کر ہم اس کا پوری طرح دیدار کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس کا پوری طرح دیدار کرکے اس کے خدوخال کی باریکیوں اور نزاکتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم دوسرا سفر جاری کرتے ہیں۔یعنی اپنی تخیل کے زور پر اپنے راہنما کی تصویر بنانے کا عمل اور یہ تصویر امام کی نہیں ہماری جان کی تصویر ہوتی ہے کہ اپنی جان کی تصویر دیکھنے کی تمنا بھی آدمی کو کسی نہ کسی صورت میں برقرار رکھتی ہے۔ جان کی تصویر سامنے آجائے تو ہم ہر طرح کے شک و شبہ سے نکل کر یقین کی راہوں میں قدم اٹھانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

انیس کے شعر زیر بحث میں ایک طرح کا چیلنج بھی ہے۔ پوری انسانیت کا ہر طرح سے کامل راہنما کون ہوسکتا ہے؟ کیسا ہوسکتا ہے؟ اور پھر بیان کے اس زور کو بھی پیش نظر رکھیئے کہ انیس پوری انسانیت کی تصویر کوئی خیالی نہیں بنا رہے ہیں۔ ان کو تو اس بات کا پورا پورا یقین ہے کہ بنی نوع انسان کا راہنما کبھی بھی خیالی نہیں ہوسکتا۔ اسے تو جیتا جاگتا انسان ہونا ہے جی ہاں گوشت پوست کا انسان لیکن اپنی جملہ انسانی بلندیوں کے ساتھ یاد رہے انیس کے عقیدے میں ٹھوس حقائق کے علاوہ کوئی بات محض خیالی نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے تخیل سے امام کی ٹھوس حقیقت کے خدوخال کو واضح کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ انیس کے راہنما اور امام میں عالم تشبیہ اور عالم تنزیہہ کی جملہ صفات موجود ہیں اور بدرجہ اتم بھی۔ اور یہ تمام نتیجہ ہے۔حتمی مرتبت حضرت محمدؐ کی تعلیم و تربیت کا' جس میں خود رسول اکرمؐ کی طرف سے کبھی کوئی کمی وقوع میں نہیں آئی اور اس انسان کامل سے

ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ بنی نوع انسان کے لئے جیسا راہنما ہونا چاہئے وہ آنحضرتؐ نے اپنی طرف سے پیش کر دیا اور ایک جان دار تسلسل کے ساتھ تا کہ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے ذہن کے مطابق اور ہر زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر اس سے راہنمائی حاصل کرتے رہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ راہنمائی حاصل کرنے کے لئے جی ہاں سچی راہنمائی حاصل کرنے کے لئے آدمی کو تعصبات سے تو بلند ہونا پڑتا ہے۔ جب تک ہم تعصبات سے بلند نہیں ہوتے اپنے راہنما پر کوئی کڑی تنقید نہیں کر سکتے۔ اس کو پرکھ نہیں سکتے۔ معلوم ہونا چاہئے نقد و نظر اور پرکھنے کا عمل کسی صورت میں بھی بے ادبی قرار نہیں پاتا۔ اس کے لئے تو جس چیز کی ضرورت ہے وہ اخلاص ہے ایسا خلوص ایسا اخلاص جو ہماری نگاہوں میں عدل و انصاف کو دیکھنے کے لئے کسی لمحے بھی بینائی کی کمی نہیں آنے دیتا۔خلوص ہر انسان کے لئے جملہ انوارِ تعقل کے سرچشمے کا کام دیتا ہے اور یہ سرچشمہ انوار ہر انسان کے پاس موجود ہے۔

میر انیس نے اپنے اس شعر زیر بحث میں ایک اور ہنر یہ دکھایا ہے کہ اپنے راہنما اپنے امام کی تصویر بنانے میں آپ کو آزاد رکھا ہے آپ اپنے خیال و ذہن کے مطابق اپنے خیال و ذہن کے مطابق اپنے امام کی تصویر بنائیں۔ اور پھر چونکہ انیس کا راہنما کوئی خیالی نہیں ہے اس لئے اپنی تصویر بنانے کے بعد آپ اسے عالم انسانیت کے اصل راہنما کی تصویر کے ساتھ ملا بھی سکتے ہیں۔ اور پھر دیکھیں اور حیرت میں آجائیں کہ آپ نے جو تصویر بنائی ہے وہ اصل راہنمائے انسانیت کی تصویر سے کس قدر مشابہت رکھتی ہے۔ دراصل انیس اس شعر میں یہی واضح کرنا چاہتے ہیں۔ کہ سچے راہنمائے انسانیت کی تصویر ہر انسان کے دل میں پہلے سے موجود ہے۔ بس ذرا اپنے دل کے دروازوں کو کھول کر اس تصویر کو

آنکھوں کے سامنے لانے کی دیر ہے۔

شعر زیر بحث کے ضمن میں ایک اور راز کی بات یہ ہے کہ اس میں انسان کے ذہنی ارتقا کے تسلسل کو واضح کیا ہے۔ یعنی ہمیں یہ شعر بتاتا ہے کہ انسان کا ذہن مسلسل ترقی کر رہا ہے اور وہ مسلسل ارتقا کے منازل سے گزر رہا ہے۔ اور نہایت خوبصورتی کے ساتھ گذر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذہنی ارتقا کے لئے آپ ذرا اپنے ذہن کو آزاد چھوڑیں یعنی تعصبات کے بندھنوں سے اسے آزادی بخشیں پھر دیکھیں کہ وہ کس طرح آپ کو ارتقا کی تانہ بہ تازہ اور نو بہ نو فضاؤں میں لے کر گوناگوں بلندیوں سے آشنا کرتا ہے آپ کو جلد ہی احساس ہو جاتا ہے کہ آپ کس انداز سے اوپر سے اوپر چلے جا رہے ہیں۔ مگر یاد رہے کہ جب آپ کے تعصبات کے بندھن ٹوٹتے ہیں۔ اور آپ کو ایک خاص انداز کی آزادی نصیب ہوتی ہے تو ایسی صورت میں آپ کتنے بھی بلند ہوتے چلے جائیں اپنی زمین کی کشش کا احساس آپ کے قدموں کو پوری طرح تھامے رکھتا ہے۔ ارتقا کے ضمن میں خیالوں کی یہ اڑان آدمی کو زمین کے ٹھوس حقائق سے غافل نہیں ہونے دیتی یعنی ایک لمحے کے لئے بھی آپ پر کسی قسم کی غفلت کا جادو نہیں چلنے پاتا۔ شعر زیر بحث میں جس ارتقائی صورتِ حال کا ذکر ہے اس میں آپ ہمہ وقت بھی مصروف کہے جا سکتے ہیں۔ اور اس مصروفیت کو آپ ٹھہر ٹھہر کر بھی اپنے آپ پر وارد کر سکتے ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شبیہ امام زماں کھینچنے میں ۲۴ گھنٹے ہم اپنے آپ کو عمل پیرا رکھتے ہیں کیونکہ یہ عمل اپنی نزاکتوں اور لطافتوں کے باعث روزمرہ کے اعمال سے ہمیشہ بلند سطح پر رہتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہمیں کبھی اس عمل کا خاصی نمایاں صورت میں احساس ہوتا ہے اور کبھی ہمارا یہ احساس دیگر اعمال کی نسبت زیریں سطح پر چلا جاتا ہے لیکن اس لطیف عمل کی یہ زیریں سطح بھی کسی بھی

نوعیت کی پستی کے قریب نہیں ہوتی۔ یہ زیریں سطح بلندیوں کی سطحوں کے حوالے سے زیریں سطح ہوتی ہے۔ اپنی اپنی ذہنی تربیت کے لحاظ سے ہر شخص کا ذہن ارتقا کے اس عمل میں اپنے اپنے طور پر مصروف رہتا ہے۔ ممکن ہے آپ یہ سن کر حیران ہوں کہ یہی وہ ذہن کا ارتقائی عمل ہے جو ہر شخص کی انا کو ہزار غرور وتکبر کی وادیوں میں بھٹکنے کے باوجود بڑی حد تک بھٹکنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ جو افراد اپنے اس فطری تقاضے کے تحت اپنے امام' اپنے راہنما کی شبیہہ بنانے' اسے اپنے سامنے لانے کے عمل خیر وخوبی میں مصروف رہتے ہیں۔وہ انا کی اس طرح طرح کی گمراہی سے پھر بھی بچے رہتے ہیں۔اور کوئی شخص جتنا اپنی انا کی گمراہی سے بچا رہتا ہے اسی نسبت سے وہ ذہنی اعتبار سے ترقی کرتا رہتا ہے۔

اپنے راہنما کا خیال رکھنا اور اس کا محض خیال نہیں رکھنا اس کو واضح طور پر سامنے لانے کی کوشش بھی کرنا یہ عمل اپنی جگہ ہے تو بہت حیات پرور اور زندگی افروز لیکن یہ کام ختم کبھی نہیں ہوتا۔ راہنما کی مسلسل تصویر بناتے چلے جانا کسی منزل پر پہنچنے کی تمنا کا ضرور پتا دیتا ہے۔ لیکن منزل پر پہنچنے کی ضمانت پھر بھی نہیں دی جا سکتی۔ اسی لئے امت مسلمہ کا ایک گروہ اپنے راہنما کو ایک حقیقی صورت میں دیکھتا ہے ان لوگوں کا راہنما خیالی نہیں اس لئے کہ انہیں اپنی منزل کی شناخت ہے جی ہاں خدا شناسی کی منزل انسانیت کے مکمل ارتقا کی منزل۔ جو بغیر کسی ٹھوس اور حقیقی راہنما کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اور آج کی زبان میں یہی ان کا سیکولر ہونا ہے ایسا سیکولر ہونا جس میں دنیا کے ساتھ دین کی بلندیوں کا احساس بھی ہمیشہ ساتھ رہتا ہے۔ اور وہ ان بلندیوں کی طرف بھی رواں رہتے ہیں۔

انسان کی اس مسلسل ارتقائی مصروفیت کے ضمن میں میر انیس نے اپنے مراثی میں ایک نئی صورت پیدا کی ہے جو صرف تخیل تک اس لئے محدود نہیں رہتی

کہ میر انیس کے یہ کردار جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں محض خیالی نہیں بلکہ حقیقی کردار ہیں۔ یعنی سانحۂ کربلا کے شہداء کے کردار تو ان کرداروں میں جو راہنما کے مسلسل ارتقا کی صورتیں نظر آتی ہیں وہ بیک وقت ہمارے دو طرح کے نفسیاتی تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ ایک تو مسلم امہ میں سے کچھ لوگوں کا جو یہ عقیدہ ہے کہ امام زندہ ہے اور اپنے وقت پر پردۂ غیبت سے عالم شہود میں آئے گا۔ یہ عقیدہ دوسرے افراد امت کے دلوں کو مطمئن نہیں کرتا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک امام زندہ ہے اور اپنے وقت پر پردہ غیبت سے شہود میں آئے گا یہ عقیدہ دوسرے افراد امت کے دلوں کو مطمئن نہیں کرتا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک امام زندہ بھی ہو اور وہ پردۂ غیبت میں چلا جائے پھر کئی صدیوں سے زندہ بھی ہو اور ایک وقت میں وہ سامنے آئے گا۔ لیکن میر انیس اپنے مراثی میں شہدائے کربلا کی جو تصویریں پیش کرتے ہیں ان کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے جیسے کہ کربلا کے یہ کردار آج بھی زندہ ہیں کیونکہ میر انیس ان کرداروں کی ایسی موثر تصویریں پیش کرتے ہیں جن میں وہی بات کہ مادی اور روحانی اقدار دونوں کے تقاضے پورے ہوتے نظر آتے ہیں۔ اور یوں راہنما کو سامنے رکھنے کی ہماری ارتقائی مصروفیت میر انیس کے مراثی کو پڑھ کر ایک طرح سے قائم رہتی ہے۔ یعنی کربلا کے یہ شہید کردار شہید ہونے کی وجہ سے زندہ بھی ہیں اور اپنے اعلیٰ کردار ہونے کے باعث ان میں ہماری ارتقائی مصروفیت کو قائم رکھنے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ مراثی انیس کا یہ پہلو بھی ان مراثی کو بغور پڑھنے سے واضح ہوتا ہے۔ ورنہ نقادوں نے ان مراثی کو عام انداز میں مطالعہ کرکے یہ بھی تو کہہ دیا ہے کہ میر انیس کے کرداروں کا مادی پہلو کمزور ہے۔ کہ ایک طرف انیس اپنے کرداروں کو اعلیٰ روحانی سطح پر لے جاتے ہیں اور دوسری طرف وہ بہت ہی عام سطح پر لے آتے ہیں۔ ان نقادوں کے خیال میں

اگر امام حسینؑ اپنے جوان بیٹے علی اکبر کو بڑے حوصلے سے جنگ کے لئے روانہ کرتے ہیں۔ تو پھر علی اکبر کی شہادت پر روتے کیوں ہیں؟ ان کی لاش کو تلاش کرتے وقت اندھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہ نقاد حضرات یہ نہیں سوچتے کہ بیٹے کو رخصت کرتے وقت امام حسینؑ کا حوصلہ ایک روحانی عظمت کا اظہار کرتا ہے ۔ جبکہ اسی بیٹے کی شہادت کی خبر سن کر حسینؑ آہ و بکا کرتے ہیں۔ یہ ان کے کردار کا بشری تقاضا ہے۔

گویا مراثیٔ انیس کے کرداروں کے ان ہر دو پہلو یعنی مادی اور روحانی پہلوؤں کو بیک وقت سامنے رکھنا اور انصاف کے ساتھ ان مراثی کی داد دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یوں دیکھا جائے تو میر انیس نے ہماری ارتقائی مصروفیت کو خاصا وقیع بنا دیا ہے یا میر انیس کے مراثی ہم سے توقع رکھتے ہیں۔ کہ ہم ان کے ہر دو پہلوؤں کو بڑی دقت نظر کیساتھ دیکھیں۔ ان مراثی کی روحانی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر داد دینا اگر آسان ہے تو ان مراثی کے مادی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر داد دینا اتنا ہی مشکل کام بھی ہے بلکہ بہت زیادہ مشکل کام ہے۔ عام آدمی کے ساتھ بڑے لوگ کس طرح گھل مل جاتے ہیں۔ اس حقیقت تک بہت کم لوگوں کی نگاہ جاتی ہے۔ مراثیٔ انیس ہماری صلاحیت نقد و نظر کو اس ضمن میں بھی بہت تربیت دینے کا موجب بن سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے نقادوں نے میر انیس کے مراثی کے اس پہلو پر آزادانہ ابھی تک نگاہ ڈالی ہی نہیں ہے۔ مراثی انیس کے اعلیٰ کرداروں کو گوشت پوست کے انسان کہنا تو آسان ہے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ کردار وہ گوشت پوست کے انسان ہو کر انسانی کردار کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بلند سے بلند مقام پر کیسے پہنچ جاتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اعلیٰ انسانی اقدار کی جملہ بلندیاں گہرائیاں اور وسعتیں انسانی گوشت پوست سے باہر کی چیزیں نہیں ہیں یہ تمام

کی تمام اعلیٰ چیزیں خود گوشت پوست کے انسان کی ذات میں موجود ہیں۔ خود اس کے گوشت پوست کے اندر پوشیدہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گوشت پوست کے انسان میں حیوانیت بھی بدرجہ اتم موجود ہے لیکن اس حقیقت سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے۔ کہ اعلیٰ انسانی اقدار بھی اسی گوشت پوست کا حصہ ہیں۔ جس طرح انسان کے لئے نرا حیوان بن جانا آسان ہے اسی طرح انسان کے لئے نرا انسان بن جانا بھی اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ سمجھ لیا گیا۔ میر انیس اپنے مراثی میں اور ان مراثی کے بلند کرداروں میں انسانی گوشت پوست کا جائزہ تو لیتے ہیں لیکن اعلیٰ انسانی اقدار کے ساتھ۔ گوشت پوست سے اعلیٰ انسانی اقدار کا مجموعہ کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اعلیٰ انسانی اقدار گوشت پوست سے کوئی الگ چیز نہیں ہیں۔ ساری گڑ بڑ اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم اعلیٰ انسانی اقدار کو انسان کے گوشت پوست سے کوئی الگ چیز سمجھ بیٹھتے ہیں۔ یا گوشت پوست کو اعلی انسانی اقدار سے کوئی اجنبی شے قرار دینے لگے ہیں۔ مراثی انیس کا مطالعہ ہمیں اس توازن کو برقرار رکھنا سکھاتا ہے۔ اگر ہم مراثی انیس کا اس طرح مطالعہ نہیں کر سکتے تو یوں سمجھ لیجئے ہم ان مراثی کے ساتھ کسی صورت میں بھی انصاف نہیں کر سکیں گے۔ اور ہمارے اس رویے سے ہماری ارتقائی مصروفیت میں خلل واقع ہو سکتا ہے۔ شبیہ امام زماں کھینچنے کے لئے بہرحال ہمیں قرطاس وقلم کی تو ضرورت پڑتی ہے اور جب تک ہمیں قرطاس وقلم میسر نہیں آتے۔ ہم تصور میں اپنی جان کی تصویر کیسے کھینچ لیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ شبیہ امام زماں پہلے ہم اپنے بدن پر کھینچتے ہیں اس کے بعد ہی ہم اپنے تصور میں تصویر جان کھینچنے کے قابل ہوتے ہیں۔ وہی بات کہ ہمارا تصور ہمارے بدن سے جدا نہیں جس طرح ہمارا بدن ہمارے تصور سے کوئی الگ چیز نہیں ہے اور اگر یہ دونوں ایک دوسرا کا پرتو ہیں تو یہ پرتو ایک دوسرے کا

ہیں۔ یہ نہیں کہ بدن کا پرتو کوئی اور ہے اور ہماری جان کا پرتو کوئی اور چیز ہے۔ پھر بھی نہ انسان کی جان انسان کے بدن کا سایہ ہے اور نہ انسان کا بدن انسان کی جان کا سایہ ہے اگر یہ دونوں سائے ہیں تو اپنے طور پر سائے ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دونوں ساتھ مل کر ہی ہمارے ارتقا کی مصروفیت کا باعث بنتے ہیں۔ اور یہ بھی بہت ممکن ہے کہ یہ دونوں ایک ہی مصروفیت کے دو نام ہوں۔ لیکن اس کو عمل میں لانا تو بڑی بات ہے اسے سوچنے کے لئے بھی ہمیں اپنے آپ کو درمیان سے نکالنا ہو گا اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ سارا مسئلہ یہ ہے کہ اہم درمیان میں سے کہیں ادھر اُدھر نہیں ہوتے۔اور نہ ہمیں ادھر اُدھر ہونے کی ضرورت ہے۔ اس ارتقائی مصروفیت سے ہم ادھر ادھر ہو گئے تو ارتقائی مصروفیت کس طرح جاری رہ سکتی ہے۔ ہمارا اپنی جگہ ڈٹا رہنا بھی بہت ضروری ہے۔ جبھی تو ہم مستقل طور پر شبیہ امام زمان کھینچنے کے قابل رہتے ہیں۔

جدال و قتال کا تصورِ نو

میر انیس کے ایک سلام میں ایک عجیب شعر موجود ہے جس میں امام حسینؑ کے جدال و قتال کے ضمن میں ہمارے سامنے بالکل ایک نیا تصور آتا ہے۔ لڑنے والا کتنا بھی بہادر اور جری کیوں نہ ہوں وہ اپنی حفاظت کا بہرحال خیال رکھتا ہے اسی حفاظت سے متعلق پرانے زمانے میں جب لڑائی کا سب سے بڑا ہتھیار تلوار ہوتی تھی تو اس کے وار سے محفوظ رہنے کے لئے پورے جسم کو زرہ سے ڈھانپ لیا جاتا تھا اور جہاں لڑنے کے لئے دائیں ہاتھ میں تلوار ہوتی تھی وہاں مخالف کی تلوار کے وار کو روکنے کے لئے بائیں ہاتھ میں ڈھال ہوا کرتی تھی۔

لیکن میر انیس امام حسینؑ کے حوالے سے فرما رہے ہیں۔

حسینؑ کہتے تھے' اک ذوالفقار کافی ہے
نبرد میں نہ زرہ چاہئے' نہ ڈھال مجھے

جدال و قتال کا یہ ایک بالکل نیا تصور ہے لیکن یہ تصور تمام تر عقیدہ پر مبنی ہے۔ عقیدہ کے بغیر آدمی زرہ اور ڈھال کے بغیر نہیں لڑ سکتا۔ گویا عقیدہ خود ایک بہت بڑی زرہ ہوتی ہے۔ اور ایک بہت مضبوط ڈھال بھی۔ اسی طرح عقیدہ نئے

نئے خیالات اور تصورات کا سرچشمہ بھی قرار پاتا ہے بشرطیکہ عقیدہ کو اندھا دھند اپنی زندگی میں شامل نہ کر لیا جائے ۔عقیدے میں بھی قدرت اور ندرت کی ضامن جو چیز ہوتی ہے وہ انسان کی غور وفکر کی قوت ہے۔ اسی لئے صحیح معنی میں عقیدہ کو اپنانا مشکل اور دشوار کام بھی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ کام آسان بھی ہے کہ انسان کی سہل انگار طبیعت عقیدہ کو تسلیم فوراً کرلیتی ہے اور وہ اس لئے کہ اسے یہ خیال ہوتا ہے کہ عقیدہ کو کم از کم اپنانے میں کیا مضائقہ ہے اس میں ہلدی لگتی ہے نہ پھٹکری لیکن رنگ چوکھا آجاتا ہے۔عقیدہ کو زبانی اپنانے سے بھی انسان کے ذہن میں ایک عافیت کی فضا تو ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ حالانکہ صحیح معنی میں عافیت کی فضا غور وفکر کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ ہاں اس فضا کے پیدا ہوجانے اور قائم ہو جانے کے امکانات اس عقیدہ کو زبانی تسلیم کرنے سے بھی واضح اور روشن ضرور ہو جاتے ہیں۔

شعر زیر بحث میں انیس واضح کر رہے ہیں۔ چونکہ امام حسینؑ کو اللہ پر پورا پورا یقین تھا اس لئے اس یقین کی بدولت امامِ عالی مقام کو معلوم تھا کہ اس دنیا کی زندگی ہزار نا پائیدار اور کم عرصہ سہی لیکن یہ زندگی اپنے معانی و مطالب اور مفاہیم کے اعتبار سے بہت اہم ہے کہ یہ زندگی اس ناپائیداری کے باوجود دنیا کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ موت تجربے کی ایک تبدیلی ہے۔ دوسری زندگی اس زندگی سے زیادہ پائدار ہوگی۔ اس لئے اگر اس زندگی میں کوئی ناسمجھ ہمیں نقصان پہنچاتا ہے۔ حتیٰ کہ مارنا بھی چاہتا ہے تو پھر بھی ہمارا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایسی صورت میں اگر ہم راہ راست پر ہیں تو ہمیں کوئی پرواہ اور خوف نہیں ہونا چاہئے۔ اس طرح کے صاحب عقیدہ کے مقابلے میں اگر کوئی لڑتا ہے۔ تو اس لڑنے کے لئے ایک عزم اور حوصلے کی تو یقیناً ضرورت ہے۔ لیکن اس کے لئے اپنی جان کی حفاظت کے

لئے کوئی زیادہ تگ و دو کرنے کی ضرورت نہیں۔

اگر امام حسینؑ یہ فرما رہے ہیں کہ دشمن سے لڑنے کے لئے میرے واسطے ذوالفقار کافی ہے اور اپنی ذات کی حفاظت کے لئے کسی قسم کی زرہ اور ڈھال کی ضرورت نہیں تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ صاحب عقیدہ آدمی تلوار اس طرح چلاتا ہے کہ پھر مد مقابل کو یہ ہوش نہیں رہتا۔ کہ وہ اس کے جواب میں کوئی حملہ کر سکے۔ اور ظاہر ہے جب دشمن اس قابل ہی نہیں رہتا۔ کہ وہ حملہ کر سکے پھر زرہ اور ڈھال کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ ممکن ہے یہاں کوئی صاحب یہ سوال اٹھائیں کو یہ سب کہنے کی باتیں ہیں کہ لڑائی میں زرہ اور ڈھال کی ضرورت نہیں صرف تلوار یا ذوالفقار کافی ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ اگر ہم ذرا غور و فکر سے کام لیں تو یہ صورت حال کوئی غیر ممکن نہیں کیونکہ اگر لڑنے والا اپنے دشمن پر ٹھیک ٹھیک حملہ آور ہو تو دشمن کو اتنا موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ جوابا کوئی حملہ کر سکے۔

اس کے علاوہ یہاں مزید سوچنے کی بات ہے کہ امام حسینؑ کے ہاتھ میں عام تلوار نہیں تھی یہ وہ تلوار تھی جو سب سے پہلے آنحضرتؐ کے پاس رہی اور پھر آنحضرتؐ نے یہ تلوار حضرت علیؑ کو عنایت فرما دی اور اس کے بعد وہ تلوار ذوالفقار حضرت امام حسینؑ کے پاس پہنچی۔ ایک ایسی تلوار جس کو پہلے ایک جلیل القدر رسولؐ نے چھوا ہو بعد ازاں اسے ایک امام عالی مقام اور وہ بھی حضرت علی ابن ابی طالب کے ہاتھ میں رہنے کا شرف حاصل ہوا ہو اس میں عام تلواروں سے کچھ الگ خصوصیات کا پیدا ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔

لیکن شعر زیر بحث میں ایک غور طلب چیز یہ ہے کہ صحیح عقیدہ کے باعث بیک وقت جو آدمی میں روحانی اور مادی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں وہ یہاں سب موجود ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شعر زیر بحث ہمیں یہ احساس پوری شدت کے

ساتھ دلا رہا ہے کہ صاحب عقیدہ ہو کر انسان نہ مادی دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ اور نہ روحانی دنیا سے یعنی صاحب عقیدہ ہو کر انسان نہ مادی دنیا سے کٹ جاتا ہے اور نہ روحانی دنیا سے یعنی صاحب عقیدہ انسان میں صرف روحانی خصوصیات ہی موجود نہیں ہوتی اس میں اسی طرح مادی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ صاحب عقیدہ انسان ہر زمانے کے ساتھ چلنے کا شعور رکھتا ہے۔ وہ کسی وقت بھی پرانا نہیں ہوتا۔ جدید سے جدید ذہن کے نتائج کے سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت اس میں موجود ہوتی ہے۔ جو شخص واقعی ایک صحیح اور سچا عقیدہ رکھتا ہے۔ ہم اسے کسی وقت اور کسی زمانے میں بھی قدامت پرست نہیں کہہ سکتے۔ قدامت پرستی کی ہوا بھی اس کو کبھی چھو کر نہیں گئی ہوتی۔ وہ ہمیشہ تر و تازہ فکری صلاحیتوں سے مالا مال ہوتا ہے۔

البتہ صحیح اور سچے عقیدہ میں جو ایک انجذابی کیفیت یا صلاحیت موجود ہوتی ہے اس کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔ یعنی صحیح عقیدہ' انسان کو حال کے ساتھ ساتھ ماضی کی ان زندہ روایات سے بھی آگاہ رکھتا ہے جو حال کے آگے بڑھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ صحیح عقیدہ کے بغیر انسان اس طرح ماضی کی خوبیوں کو اپنی ذات میں جذب نہیں کر سکتا۔ جس طرح ایک صحیح عقیدے کا حامل انسان کر سکتا ہے۔ عقیدہ نہ ہو تو انسان اپنے ماضی سے ایک طرح ہاتھ دھو بیٹھتا ہے گویا پوری انسانی تاریخ اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہوتی ہے۔ اور وہ ہزار اپنے حال میں زندہ ہو صحیح معنی میں زندہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ عقیدہ کے بغیر وہ حال کے تقاضوں کو پوری طرح جان نہیں سکتا۔ یا اپنی ذات میں جذب نہیں کر سکتا ۔ عقیدہ آدمی کو ہمیشہ تر و تازہ اور جدید رکھتا ہے۔

شعر زیر بحث میں میر انیس جو امام عالی مقام کی زبان سے یہ کہلوا رہے ہے

ہیں کہ مجھے لڑائی میں زرہ اور ڈھال کی ضرورت نہیں میرے لئے ایک ذوالفقار کافی ہے تو یہ کوئی پرانی بات نہیں ہے یا اس کہنے کو ہم کس طرح بھی رجعت پسندی سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ اس کہنے میں تو جدتِ فکر وعمل دونوں ہی کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔عقیدہ کی بدولت انسان لڑائی میں اتنا ماہر ہو جاتا ہے۔ کہ پھر وہ اپنے دشمن کو یہ موقع ہی نہیں دیتا کہ وہ اس پر وار کر سکے۔لیکن وہی بات کہ یہ مہارت کوئی عجوبہٴ روزگار نہیں بلکہ ایک عقیدہ کا عام دین ہے اور ہر آدمی کی شخصیت کے لحاظ سے یہ مہارت بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ عقیدہ کا جو ایک سب سے بڑا عمل ہے وہ یہ ہے کہ عقیدہ انسان میں ترجیحات کا شعور پیدا کر دیتا ہے۔یعنی اس وقت کس چیز کو سامنے رکھنا یا لانا ہے اور کس چیز کو فی الحال التوا میں رکھنا ہے۔ ترجیحات کے اس شعوری بدولت کام کو سر انجام دینے کی صلاحیت میں بلا کی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ عام حالات میں تو ٹھیک ہے کہ آپ کو لڑائی میں زرہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ڈھال کی بھی لیکن اگر آپ کسی خاص لڑائی میں مصروف ہیں تو وہاں آپ کے لئے یہی زرہ اور ڈھال ایک طرح کا بوجھ بن جاتی ہیں۔ اور جتنی دیر میں آپ ان دونوں چیزوں کا خیال رکھیں گے اتنی دیر میں بہت کچھ آپ کے ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔

صاحب عقیدہ انسان کے لئے زماں ہی نہیں مکان کا شعور بھی اپنی بلندیوں پر آجاتا ہے۔ یعنی ان تمام بلندیوں کے باوجود صاحب عقیدہ انسان کے پاؤں جس طرح زمین پر جمے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور جس مضبوطی کے ساتھ جمے ہوتے ہیں۔ یہ بھی انسانی حوالے سے کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ امام حسین میدان کربلا میں یہ فرما رہے ہیں کہ یہاں مجھے زرہ اور ڈھال کی ضرورت نہیں میرے لئے ذوالفقار کافی ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں یقین ہے اس

میدانِ کار زار میں عام انداز سے لڑائی نہیں لڑی جائے گی۔ یہاں تو دشمن کو یہ فرصت ہی نہیں دیتی کہ وہ لڑتے وقت خود حملہ کر سکے۔ یہ بالکل الگ بحث ہے کہ امام نے جب تک اور جہاں تک دشمن سے لڑنا مناسب سمجھا لڑے اور پھر ذوالفقار کو نیام میں ڈال دیا گویا دشمنوں کو حملہ کرنے کا موقع دے دیا۔ ذوالفقار کے ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب علی بن ابو طالب ذوالفقار لے کر جنگ فرماتے ہیں تو یہ ذوالفقار ان دشمنوں کو نہیں مارتی تھی جن کے سلب میں آئندہ کے لئے کسی مومن بچہ کی روح ہوتی تھی۔ یہ بات بھی شاید جدید ذہن کو عجیب معلوم ہو لیکن صاحب عقیدہ انسان کی یہی وہ بصیرت ہے جس کو سمجھنے کے لئے صحیح معنی میں مسلمان ہونا ضروری ہے۔ صرف زبانی نہیں دل سے ایمان لانے والی بات۔۔ اور یہ عقیدہ کیا ہے۔۔۔ اللہ پر یقین' اس کے انبیاء پر یقین اور زندگی کے تسلسل پر یقین یعنی یہ یقین کہ زندگی اس دنیا تک محدود نہیں آگے اس سے بھی بڑی زندگی ہے۔ بظاہر یہ عقیدہ بہت سیدھا سادا نظر آتا ہے۔ تمام انبیاء اور آخر میں ہمارے ختم المرسلین یعنی حضرت محمدؐ اور ان کی آلؑ اس عقیدہ کو لوگوں کے دلوں میں اتارنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن یہ عقیدہ اپنی تمام سادگی کے باوجود آج تک لوگوں کی بلکہ خود مسلمانوں کی اس کج فہمی کو دور نہیں کر سکا کہ اس دنیا سے آگے کوئی دنیا کیا ہو سکتی ہے۔ انسان کی یہ کج فہمی ہی نہیں کوتاہی ہے تنگ دلی ہے۔ تنگ نظری ہے۔ اور اس تنگ نظری تنگ دلی کو دور کرنے کے لئے حسینؑ صرف ذوالفقار پر بھروسہ کر رہے ہیں۔ اپنی جان کی حفاظت کرنے والی اشیاء زرہ اور ڈھال وغیرہ پر نہیں۔ شعر زیر بحث کا یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ زرہ اور ڈھال نہ ہونے سے تلوار کو مزید احتیاط سے اٹھانا پڑتا ہے۔ ویسے حضرت علیؑ بھی میدان ہائے کار زار میں یہی کرتے رہے۔ یوں میدانِ کربلا میں حسینی فوج کا ہر لڑنے والے اسی انداز کا لڑنے

والا تھا جس لڑائی کو میر انیس نے اپنے مراثی میں نہایت حسن و خوبی سے بیان فرمایا ہے۔ لڑکے بالوں کی جنگ دیکھ لیجئے یا نوجوانوں اور جوانوں کی جنگ اس میں شجاعت کے ساتھ ساتھ اس احتیاط کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے خواہ کتنی بھی گھمسان کی جنگ کیوں نہ لڑی جا رہی ہو۔ امام حسین لڑائی کے لئے میدانِ کارزار میں تشریف لا رہے ہیں۔ امام عالی مقام کے سب یار و مددگار ختم ہو چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی۔

جب آمد سردار دو عالم ہوئی رن میں　　سب فوجِ عدو درہم و برہم ہوئی رن میں

یہ تو آغاز ہے اِسی مرثیے کا دوسرا بند ملاحظہ ہو۔

اعجاز رسولانِ سلف ان میں ہے موجود　　آہن کو ابھی موم کریں صورتِ داؤد
اُف کر دیں تو جل جائے یہ سب لشکرِ مردود　　پر ہیں یہ طلب گار رضامندی معبود

ساری احتیاط کا سرچشمہ رضامندئ معبود ہے۔ اسی بند کی بیت ہے۔

صدقے کیا اکبر سا پسر راہِ خدا میں
خوش ہو کے لٹا دیتے ہیں سر راہِ خدا میں

اس کے بعد امام حسین رجز پڑھتے ہیں پھر دشمن کی فوج کو سمجھاتے ہیں اور جب اس سمجھانے کو فوجِ عدد نے امام کی کمزوری سمجھا تو اس کے بعد امام عالی مقام نے زور کی جنگ کی مگر عین اسی عالم میں خیال آیا جیسے حضرت علیؑ فرما رہے ہیں۔

سرنذر کرو صادق الاقرار ہو تم تو
امت کی شفاعت کے طلب گار ہو تم تو

اگلا بند ہے۔

آواز پدر سنتے ہی تلوار کو روکا　　پھر بڑھ کے نہ پیدل کو نہ اسوار کو روکا
کفار پہ چلتی ہوئی تلوار کو روکا　　روکا اسے کیا برقِ شرر بار کو روکا

فرمایا اب اٹھے گا نہ ہاتھ اہل جفا پر
موقوف رکھا ہم نے یہ انصاف خدا پر

لیکن واضح ہو کہ تلوار کو روک کر یا اپنا حوصلہ دکھا کر جی ہاں حوصلہ صبر و تحمل دکھا کر جو انصاف کو خدا پر موقوف رکھا ہے یہ اپنی لڑائی کو ختم کر دینے کی مترادف نہیں ہے بلکہ اس لڑائی کو اللہ کے سپرد کر دینے والی بات ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا پر انصاف کو موقوف رکھنا اس موضوع پر غور و فکر کے بے شمار دروازے کھول دینے کے برابر ہے۔ گویا امام عالی مقام نے صبر و حوصلہ دکھا کر عالم انسانیت کے لئے غور و فکر کی نئی نئی راہیں فراہم کر دی ہیں۔ ہم غور و فکر کے لئے ہی تیار نہ ہوں تو الگ بات ہے ورنہ میر انیس اپنے میراثی میں غور و فکر کے بار بار مواقع سامنے لاتے ہیں۔ اور یہی میر انیس کی وہ شاعرانہ بصیرت ہے جو ہمیں دوسرے بڑے مرثیہ نگاروں میں بھی کم نظر آتی ہے۔ ایک دوسرے مرثیے میں یہی صورت حال ہے کہ سب رفقا اور عزیز و اقارب شہید ہو چکے ہیں اور حسین تن تنہا جنگ کر رہے ہیں۔ یہاں میر انیس نے جو مادی اور روحانی دونوں طرح کی صورتوں کو جمع کیا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میر انیس کے ہاں میدانِ کربلا میں حسینی فوج کا اور خود حسینؑ کا جو کردار ایک طرف روحانی بلندی پر اور دوسری طرف گوشت پوست کا انسان ہونے کی زمینی صورت میں اپنی شدت پر نظر آتا ہے۔ اس کو سمجھنا اور گرفت میں لانا کوئی آسان کام نہیں ایسے ہی مواقع ہیں جن پر نقادوں نے میر انیس کے فنی کمزوری بتائی ہے حالانکہ ایسی بات ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ ہاں تو میں مرثیے کے وہ چند بند ذیل میں تحریر کر رہا ہوں ۔ میں اس طرح مثالیں دینا کا عموماً قائل نہیں ہوں اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ میرے مضامین میں کم سے کم امثال یا اقتباسات اسی لئے دیئے گئے ہیں کہ مثالیں آپ

خود کلامِ انیس کو مطالعہ کر کے ملاحظہ فرمائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ بہرحال یہاں مرثیے کے ان بندوں میں صورتِ حال وہی ہے کہ سب اعزا ختم ہو گئے ہیں۔ اور حسین ایسے لڑے کہ فوج ان سے دور بھاگ گئی۔

فاقے میں دیر تک جو لڑے شاہ تشنہ کام　　غرق عرق تھے کانپ رہا تھا بدن تمام
ہاتھوں سے چھوڑ دی تھی جو راہوار کی لگام　　آنکھیں تھیں بند ہانپتا تھا اس پہ تیز گام
غش میں سوارِ دوشِ نبی کا یہ حال تھا
بے تھامے خود فرس سے اترنا محال تھا

دیکھا جو یہ کہ بھاگ گئے ان سے حیلہ ساز　　تلوار رکھ کر میان میں بولے شہ حجاز
مہلت ہے اسے حسین پڑھو عصر کے نماز　　یہ آخری ہے بندگئی ربِ بے نیاز
فکر نجات امتِ خیر البشر کرو
سوکھی زباں کو ذکر الٰہی میں تر کرو

ناگاہ سوئے لاشِ پسر جا پڑی نظر　　چلائے دل کو تھام کے سلطانِ بحر دبر
اکبر اٹھو کہ گھوڑے سے گرتا ہے اب پدر　　سوتے ہو تم دھرے ہوئے رخسارہ خاک پر
بھولے پدر کو نیند میں قربان آپ کے
آؤ نمازِ عصر پڑھو ساتھ باپ کے

اسی طرح علمدار بھائی کے لاشے سے مخاطب ہو رہے ہیں۔

عباس نامدار ترائی سے اٹھ کے آؤ　　پھنکتا ہے قلب جل رہے ہیں سب جگر کے گھاؤ
چھڑکو مری زرہ پہ جو پانی کہیں سے پاؤ　　چلتے ہوئے عدم کے مسافر سے مل تو جاؤ
ہم سب کے کام آئیں ہیں پیٹے ہیں روئے ہیں
بارہ پہر ہوئے کہ نہ لیٹے نہ سوئے ہیں

کیا بافضا یہ سرد ترائی ہے اب اٹھو ہم جاں بلب ہیں ختم لڑائی ہے اب اٹھو
نرغے میں فوجِ ظلم کے بھائی ہے اب اٹھو عباس دھوپ چہرے پہ آئی ہے اب اٹھو
غفلت کی تم کو نیند ہے شبیر کیا کرے
میری طرح کسی کو نہ بیکس خدا کرے

تم جب سے چھوٹے ساعد و بازو میں درد ہے گردن میں سر میں آنکھ میں ابرو میں درد ہے
دل میں کمر میں سینے میں پہلو میں درد ہے رگ رگ میں کیا ہر ایک بن مو میں درد ہے
ہر مرتبہ لڑے ہیں لہو میں نہائے ہیں
پیری میں نوجوانوں کے لاشے اٹھائے ہیں

چلایا فوج کو پسر سعد نابکار لو رکھ لی میان میں شہ والا نے ذوالفقار
پلٹے پرے سواروں کے لے کر رسالہ دار دو غول باندھے آئے کماں دار دس ہزار
تیر افگنوں میں تیغوں سے بھالوں میں گھر گئے
تنہا حسین برچھیوں والوں میں گھر گئے

اس کے بعد انیس کی شاعرانہ بصیرت آپ سے سوال کر رہی ہے۔

فریاد ہے وہ فوج کا دل اور اک حسینؑ وہ بے شمار تیغوں کے پھل اور اک حسینؑ
وہ تیر جانستاں وہ جدل اور اک حسین وہ سینکڑوں پیامِ اجل اور اک حسین
فوجوں میں شام کے مہ تاباں گھرا ہوا
بیکس بھی وہ کہ جس سے زمانہ پھرا ہوا

ڈوبے ہوئے تھے خون میں گیسو حسین کے آنکھوں پہ کٹ کے آ پڑے ابرو حسین کے
زخمی ہیں دونوں ساعد و بازو حسین کے تیروں نے چھان ڈالے تھے پہلو حسین کے
تیغیں اپی ہوئی جو برابر سے چل گئیں
غش آ گیا قدم سے رکابیں نکل گئیں

گرتے ہیں آپ کون سنبھالے کوئی نہیں　　سینے سے کون تیر نکالے کوئی نہیں
بے جاں پڑے ہیں گو کے پالے کوئی نہیں　　سب مر چکے ہیں چاہنے والے کوئی نہیں

بیکس ہیں اور سامنا فوجِ عدو کا ہے
منہ جس کا دیکھتے ہیں وہ پیاسا لہو کا ہے

آپ نے ملاحظہ فرمایا امام مظلوم آخری وقت تک جدال و قتال کرتے رہے لیکن یہ جدال و قتال ان کے عقیدے کی ایک عملی صورت تھا جس میں وہ دشمنوں سے لڑتے بھی تھے ان کو سمجھاتے بھی تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے نانا کی امت کے لئے دعا بھی کرتے تھے۔ اور امامِ عالی مقام کے اس تمام عمل میں ہمارے لئے غور و فکر کے بے بہا خزانے موجود ہیں۔ جن سے ہمیں نہ صرف مالا مال ہونے کی ضرورت ہے۔ بلکہ ان خزانوں کو کام میں لانا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

دلوں کی شکستگی کا مسئلہ

(میر انیس کے ایک شعر کے حوالے سے)

میر انیس کی شاعرانہ بصیرت نے سانحۂ کربلا کے حوالے سے عجیب عجیب انداز میں اپنا اظہار کیا ہے یہ اظہار مراثی میں تو بہت واضح ہے لیکن سلاموں میں اس اظہار نے فصاحت و بلاغت کے انوکھے اور نازک روپ دھارے ہیں۔ ان نزاکتوں کو جتنا سمجھنا اور گرفت میں لانا مشکل ہے اسی نسبت سے یہ نزاکتیں جب ہماری گرفت میں آجاتی ہیں۔ تو ہم پر مفاہیم و مطالب کے نئے نئے ابواب کھلتے ہیں۔ بنیادی طور پر صنف سلام میں انیس ایک غزل گو کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ لیکن اپنی اس حیثیت میں بھی وہ فضائے کربلا کی اہمیت کو کسی طرح بھی فراموش نہیں کرتے۔ بلکہ سلاموں میں فضائے کربلا کی وسعتیں کچھ زیادہ ہی منکشف ہوتی ہیں۔ اور اس حوالے سے انسانی نفسیات کے ایسے ایسے گوشے واضح ہوتے ہیں جن کی وضاحت بنی نوع آدم کے لئے کچھ اور ہی طرح کی قدر و منزلت رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر میر انیس کے ایک سلام کا یہ شعر لیجئے۔

کسی کو کیا ہو دلوں کی شکستگی کی خبر
کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

اس شعر میں انیس نے انسانی معاشرہ کے ایک بہت بڑے مسئلے کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے۔ یوں تو انسان ایک سماجی جانور ہے۔مل جل کر رہنے والا لیکن جس قدر وہ ایک سوشل اور سماجی جانور ہے اس سے کہیں زیادہ انا پرست اور تنہائی کا مارا ہوا بھی ہے۔ میں نے تنہائی کا مارا ہوااس لئے کہا ہے کہ اس کی انا اپنا بدلہ اتارنے کے لئے انسان کو تنہائی میں قید کر دیتی ہے جبکہ فی الحقیقت وہ تنہائی کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر وہ تنہائی کو پسند بھی کرتا ہے تو اپنی جلوت پر یا اپنی اجتماعی زندگی پر ایک گہری اور دلچسپ نظر ڈالنے کے لئے' اسی لئے حضرت علیؑ نے فرمایا ہے۔ التودۃ نصف العقل میل جول آدھی عقل ہے۔ یعنی ایک دوسرے سے ملتے وقت ہمیں بہت چوکنا اور چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ اپنے ملنے والے کی ایک ایک حرکت ایک ایک جنبش نگاہ و ابرو کو خاطر میں رکھنا پڑتا ہے اور اگر ایسا نہیں کرتے تو ہمیں کچھ پتا نہیں چلتا کہ ہم نے کب اس کا دل دکھا دیا اور اندر ہی اندر اسے اپنے سے ناراض کر دیا۔ستم بالائے ستم یہ کہ ناراض ہونے والا اپنی ناراضی کو ہم پر واضح نہیں کرتا۔ اور پھر جب انتقام کے طور پر وہ ہم سے تغافل یا عدم توجہی برتتا ہے تو اسے ہمارے دل کے ٹوٹنے کی خبر نہیں ہوتی کیونکہ وہ اپنی جگہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھ رہا ہوتا ہے۔ غرض انسان یوں تو سوشل اور ملنے ملانے والا جانور ہے لیکن عموماً وہ ملنے ملانے میں اس قدر ذہانت اور شعور سے کام نہیں لیتا جس قدر کہ اسے لینا چاہئے۔

یہاں سب سے نازک پہلو اس مسئلہ شکستگیٔ دل کا یہ ہے کہ دل کے ٹوٹنے کے اثرات بہت دور تک جاتے ہیں۔ اس میں صرف جس نے دل توڑا اور جس کا دل ٹوٹا وہی دو افراد شامل نہیں ہوتے۔ بعض وقت پورا معاشرہ اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ جس معاشرہ میں افراد ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ معاشرہ

انسانی ارتقا کے مراحل کو مسلسل طے کرنے کے قابل رہتا ہے۔ اس کے ارتقا میں وقفے نہیں آتے۔ اس کے علاوہ اس ارتقا میں انسانی اقدار کا خیال رکھنا افراد کے لئے سرفہرست ہوا کرتا ہے۔ یہ لوگ اپنی سوجھ بوجھ کی ساری صلاحیتوں کو اقدار کے بنانے سنوارنے میں صرف کرتے ہیں۔ ہم اس کو آئیڈیل معاشرہ کہہ تو سکتے ہیں۔لیکن اتنا کچھ خیال رکھنے کے باوجود ضروری نہیں۔ کہ افراد معاشرہ سے کہیں نہ کہیں بھول چوک نہ ہو جائے۔ لہٰذا کوئی نہ کوئی کسر باقی رہتی ہے۔ اور ایسی صورت میں ارتقا کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے۔ یعنی کوئی معاشرہ کتنی بھی ترقی کر جائے۔ ہم پھر بھی اسے ترقی کی آخری منزل پر نہیں کہہ سکتے۔ اور یہ ایک صحت مند رویہ ہے۔ لیکن اس طرح کا صحت مند رویہ لوگوں میں کم پایا جاتا ہے۔ عموماً لوگ ملنے ملانے میں احتیاط کم برتتے ہیں۔ جس کی وجہ سے دل ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اور معاشرہ اس تیزی سے ترقی نہیں کرتا۔ جس تیزی سے کہ اسے ترقی کرنی چاہئے۔

میر انیس اپنے زیر بحث شعر میں جہاں دل کے معاملات کی نزاکت کا ذکر کر رہے ہیں وہاں وہ یہ شکایت بھی کر رہے ہیں کہ جب لوگوں کو ایک دوسرے سے کوئی تکلیف پہنچے تو اسے واضح کر دینا چاہئے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہ رہے مگر اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ دل کے شیشے ٹوٹتے وقت آواز پیدا نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ لوگ آپس میں میل ملاقات سے جو غلط اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی وضاحت نہیں کرتے۔ ویسے کسی حد تک شکایت نہ کرنا۔ لوگوں کے مہذب ہونے کی دلیل بھی ہے لیکن یہ تہذیب یافتہ خاموشی اس وقت سودمند ثابت ہوسکتی ہے جب دوسرا شخص بھی حساس ہو اگر دوسرے شخص کو اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوتا تو اس طرح کی مہذب خاموشی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ غلط فہمی اپنی جگہ موجود رہتی ہے۔ بلکہ وہ دل میں رہ کر مزید برے اثرات پیدا کرتی ہے۔

اور پھر وہی بات کہ ان اثرات کے نتائج بعض اوقات بہت ہی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ ہمیں ان شکایات کو جو آپس میں میل ملاقات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اپنے دل میں نہیں رکھنا چاہئے۔ بلکہ جتنی جلدی ہم ان شکایات کو دوسروں پر واضح کرتے ہیں اتنا ہی معاشرے کے حق میں بہتر رہتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ لوگ شکایات سننے کے لئے بھی عموماً تیار نہیں ہوتے۔ وہ جس طرح کی بھی غلط حرکت کرتے ہیں اسے اپنی جگہ درست بھی سمجھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اسی لیے میر انیس نے شعر زیر بحث میں بڑی خوبصورتی سے شکایات کو اپنے تک رکھنے کا اظہار کیا ہے اور دل کے شیشوں کو ایسے شیشے قرار دیا ہے جو ٹوٹتے وقت صدا نہیں دیتے۔

لیکن شعر زیر بحث کو بغور دیکھا جائے تو میر انیس کا منشا یہی ہے کہ ہم میں ایک دوسرے کی شکایات کو سننے اور سنانے کا حوصلہ ہونا چاہئے۔ ورنہ اور ''ورنہ'' اس شعر میں اس قدر پوشیدہ ہے جس کو معلوم کرنا بھی خاصا نازک کام ہے لیکن اس ورنہ کو میر انیس نے اپنے اس شعر زیر بحث میں بیک وقت پوشیدہ رکھنے اور واضح کرنے میں جس مہارت اور جس ہنر سے کام لیا ہے اس کی داد دنیا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انیس کہہ رہے ہیں آئے دن ہمارے دلوں کے شیشے ٹوٹتے رہتے ہیں۔ لیکن ان شیشوں کے ٹوٹنے سے کوئی آواز پیدا نہیں ہوتی اب ہمارا فرض اپنی جگہ یہ ہے کہ ہم ان شیشوں کے ٹوٹنے کو جس طرح بھی بن پڑے معلوم کرتے رہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ معلوم کرنا عام انداز سے ایک الگ انداز جستجو کا طلب گار ہے۔ اور میں نے ابھی ابھی دلوں کے شیشوں کے ٹوٹنے کی کوئی آواز نہ ہونے کو جو مہذب خاموشی سے تعبیر کیا ہے اس تہذیب یافتہ یا مہذب خاموشی کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ بس ذرا ہمیں اپنی ذات سے باہر نکلنے کی زحمت کرنا

ہوتی ہے۔ اور میر انیس کے اس شعر کے مطابق اس طرح اپنی ذات سے ہمارا باہر نکلنا بہت ضروری ہے ورنہ۔ ہماری عدم توجہی ایسا سانحہ بھی برپا کرسکتی ہے۔ جیسا سانحہ کہ کربلا میں واقع ہوا۔ اور جب ایسا سانحہ وقوع میں آجاتا ہے۔تو پھر دلوں کے شیشوں میں سے ایسی قیامت خیز آوازیں بلند ہوتی ہیں جیسا کہ سانحۂ کربلا میں بلند ہوئیں۔ بلکہ یہ آوازیں تو اسی وقت بلند ہونا شروع ہوگئی تھیں جب امامِ مظلوم نے مدینے سے ہجرت فرمائی تھی۔ حالانکہ امام عالی مقام نے خود اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کیا تھا۔مگر ایک انداز میں کیا بھی' اس خاموش اظہار سے بھی خود مدینے کے لوگوں کے دلوں پر کیا کیا قیامتیں گزریں میر انیس نے اس کا اظہار بھی اپنے ایک مرثیہ میں اس طرح کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

برپا ہے مدینے میں تلاطم کئی دن سے　　ہے راحت و آرام وطرب گم کئی دن سے
ہر گھر میں ہے شور اور تظلم کئی دن سے　　منہ ڈھانپے ہوئے روتے ہیں مردم کئی دن سے
وہ غم ہے کہ آرام کا جو یا نہیں کوئی
راتیں کئی گذریں ہیں کہ سویا نہیں کوئی

جس روز امام حسینؑ رخصت ہونے والے ہیں۔ اس روز کی مدینے میں کیا حالت تھی۔ ملاحظہ فرمائیے۔

خلقت کا ہے مجمع درِ دولت پہ سحر سے　　جو آتا ہے روتا ہوا آتا ہے وہ گھر سے
سب کہتے ہیں برسا ہے لہو دیدۂ تر سے　　چھپ جائے گا اب فاطمہ کا چاند نظر سے
اندھیر ہے گر یہ شہ والا نہ رہے گا
اب شہر کی گلیوں میں اجالا نہ رہے گا

ظاہر ہے امامِ مظلوم کے دل کو توڑا گیا اور اس بات پر توڑا گیا کہ انہوں نے ایک فاجر و فاسق کی بیعت کیوں نہیں کی۔ وجہ عام دل توڑنے کی وجہ عام نہیں

تھی، خاص تھی اسی لئے اس میں شیشہ دل کے ٹوٹنے کی آوازیں بھی زبردست پیدا ہوئیں۔ لیکن انیس شعر زیرِ بحث میں بتانا یہ چاہتے ہیں کہ جس معاشرے میں روز مرہ عام زندگی میں لوگوں کے دل توڑے جاتے ہیں اور ان دلوں کے ٹوٹنے کی آواز نہیں آتی۔ تو کسی معاشرے کے لئے یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ عام زندگی میں بھی لوگوں کو آپس میں ایک دوسرے کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ دل توڑنا ایک عادت بن جاتی ہے۔ خاص طور پر دل توڑنے کے اور دل ٹوٹنے کے عمل میں جو ایک نزاکت کا احساس ہوتا ہے اسے تو کسی طرح بھی ختم نہیں ہونا چاہئے۔ اول تو دل کو توڑا ہی کیوں جائے، چلئے ہم تسلیم کرتے ہیں۔ روز مرہ زندگی کی گونا گوں مصروفیات کی وجہ سے بے خیالی میں بھی دل توڑ دیئے جاتے ہیں۔ اگر بے خیالی میں دل توڑے جاتے ہیں۔ ان کا علاج یہی ہے۔ کہ دل توڑنے اور دل ٹوٹنے کے احساسِ نزاکت کو باقی رکھا جائے کیونکہ اصلاح احوال کی ایک یہی صورت ہمارے سامنے باقی رہ جاتی ہے۔

اگرچہ لفظ نزاکت شعر زیرِ بحث میں کہیں نہیں آیا لیکن نزاکت کا مفہوم اس شعر کی جان ہے اور پھر مزید لطف کی بات یہ ہے کہ اس شعر میں جو نزاکت جاری و ساری ہے اسے سمجھنے کے لئے بھی ایک علیحدہ حس کو ڈویلپ Develop کرنے یعنی فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ اور پھر اس حسِ نزاکت کو فروغ دینا اپنی جگہ بہت ہوشیار رہنے والی بات ہے۔ اصل بات یہاں یعنی اس شعر میں انسانوں کا آپس میں میل میلاپ ہے۔ وہی بات کہ انسان طبعًا ہے تو سماجی سوشل جانور لیکن دو انسانوں کا آپس میں ملنا ایک دوسرے کے خیال رکھنا کا نازک ترین عمل ہے۔ اس لئے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں حضرت علیؑ نے جو یہ فرمایا ہے التودہ نصف العقل میل جول آدمی عقل ہے یعنی باقی دنیا کا کام ایک طرف اور یہ آپس

میں ملنا جلنا ایک طرف گویا آپ کو دوسرے سے ملتے وقت بہت لحاظ رکھنے والا اور ہوشیار ہونا چاہیئے۔ ورنہ ہلکی سی غلط فہمی سے کوئی بڑا کام خراب ہی نہیں ہو سکتا ہے دوسروں کو بھی بری طرح خراب کر سکتا ہے۔

انیس نے شعر زیر بحث میں انسان کی اس فطری شرم و حیا کا بھی نہایت خوبصورتی سے ذکر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ دوسرے لوگوں کی باتوں کو برداشت کے ساتھ سن لیتا ہے۔ اور اپنے ان ابنائے جنس کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی غلط باتوں پر توجہ دے سکیں۔ دراصل دل کے شیشے اگر ٹوٹتے وقت آواز نہیں دیتے تو یہ ان کے صبر و تحمل اور حوصلے کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر دوسری طرف انیس نہایت احتیاط کے ساتھ یہ شکوہ بھی کر رہے ہیں کہ لوگ اپنی غلط کہی ہوئی باتوں پر توجہ کہاں دیتے ہیں اور وہ توجہ دیں بھی تو کس طرح کہ دلوں کے شیشے ٹوٹتے وقت آواز نہیں دیتے۔ یعنی غلط باتوں کو برداشت کرنے کی بجائے انہیں لوگوں پر واضح کرنا چاہیئے تا کہ غلط فہمیاں دلوں میں پرورش نہ پاتی رہیں۔ اور یہ توجہ نہ دینے کا سلسلہ اتنی دور تک جا پہنچتا ہے۔ کہ پھر بات عظیم سانحۂ کربلا تک پہنچ جاتی ہے۔ اگر اول آنحضرتؐ کی باتوں کو لوگ غور سے سنتے تو انہیں صحیح معنی میں ایمان کی دولت مل جاتی اور اس طرح انہیں خیر کثیر حاصل ہو جاتا اور جب نبی آخر الزمان نے یہ دیکھا کہ لوگ ان کی باتوں کو غور سے نہیں سنتے۔ تو انہوں نے اپنے خاندان کے قریبی افراد حضرت علیؓ جناب فاطمتہ الزہراؓ اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ کو یہ تمام ایمان افروز باتیں بتائیں۔ لیکن لوگ مسلسل غفلت کا شکار رہے اور نہ صرف نبیؐ تک بات محدود رہی ان کی اولاد کی باتیں بھی لوگوں نے غور سے نہیں سنی اور یوں اولادِ نبی کے دلوں کو مسلسل ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا رہا۔ مگر امام حسینؑ نے اپنے دل کے شیشے کے ٹوٹنے کی آواز کو دبایا نہیں بلکہ اس قدر بلند کیا کہ دو عالم میں ایک طرح انقلاب برپا ہو

گیا۔ مگر یہ سب انقلاب مسلم امہ کی بھلائی اور خیر کے لئے تھا۔ ادھر انسان کی طبع گریزاں پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے بڑے بڑے علما اور مفکرین نے امام حسینؑ کی آواز پر غور کرنے کے بجائے زیادہ تر یہی مناسب سمجھا کہ تاریخ کا مطالعہ ہی نہ کیا جائے۔ حقائق سے فرار کی یہ صورت بھی سخت عبرت ناک ہے کہ ہمارے دانشور اپنی تاریخ کا مطالعہ جرأت و ہمت سے کرنے کی بجائے ہمیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہم تاریخ کے ان حصوں کا مطالعہ ہی نہ کریں جو ہمارے سامنے حقائق کو صحیح معنی میں پیش کرتے ہیں۔ ہم اپنے آپ پر اپنی ذات پر اور اپنے ذوقِ نقد و نظر پر اس سے بڑا ظلم اور کیا کر سکتے ہیں کہ ہم تاریخ کا سورج سمجھ کر مطالعہ نہ کریں۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال اعتراض کے طور پر اٹھایا جائے۔ کہ دلوں کی شکستگی کا تعلق ہماری توجہ کو سانحۂ کربلا کی طرف کس طرح مبذول کرا سکتا ہے تو میں جواباً یہی عرض کر سکتا ہوں کہ دلوں کو توڑنے اور دلوں کو ٹوٹنے کی بات اگر کربلا والوں کی طرف ہماری توجہ کو مبذول نہیں کراتی تو خدا کے لئے مجھے بتایئے امام حسینؓ اور نواسہ رسولؐ کے دل سے بڑھ کر بھی کوئی دل اس بری طرح توڑا گیا ہے اور پھر حسینؓ ہی کا نہیں کربلا میں کس کس کا دل نہیں توڑا گیا۔ مگر وہی بات کہ کربلا میں اس بری طرح کبھی دل نہ توڑے جاتے اگر لوگ نبی آخر الزمان کی اور ان کے اصحاب پاک کی اور ان کی اولاد کی باتوں کو غور سے گوش گزار کر لیتے۔ جبکہ کربلا میں تو دلوں کے شیشوں ٹوٹتے ہوئے ایسی بلند آوازیں پیدا کر رہے تھے کہ جن کا شورعرش تک پہنچ رہا تھا۔ گویا انیس اپنے شعر زیر بحث میں ہمیں بتا رہے ہیں کہ اگر ہمارے دلوں کے شیشوں کے ٹوٹنے کی آوازوں کو ہمارے کان سننے سے معذور ہو گئے ہیں تو ان کانوں کے نقص سماعت کو دور کرنے کے لئے ایک علاج یہ

بھی ہے کہ وہ کربلا والوں کے دلوں کے ٹوٹنے کی آوازوں کو سنیں اور ان آوازوں کو سننا آسان اس لئے ہے کہ یہ شیشے اس طرح ٹوٹے ہیں کہ ان کے ٹوٹنے کی آوازیں آج تک اسی زور شور سے سنائی دے رہی ہیں ۔ جیسی کہ وہ اس وقت سنائی دے رہی تھیں جب وہ شیشے ٹوٹے تھے لیکن شاید اس وقت آس پاس کے لوگوں کو سماعت کی صلاحیت جواب دی گئی تھی یا وہ ان آوازوں کو سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اب تو کربلا والوں کے دلوں کو ٹوٹنے کی آوازیں اس قدر صاف سنائی دیتی ہیں۔ کہ آدمی ذرا بھی توجہ سے کام لے تو ان آوازوں کو آسانی کے ساتھ سن سکتا ہے۔ لیکن انسان کی طبع گریزاں کا ایک کرشمہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی توجہ کی ذمہ داری بھی دوسروں پر ڈالنے کے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے۔ اور ان بہانوں میں ایک بہانہ یہ بھی ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جو کہہ دیا ہے کہ تاریخ مت پڑھو۔ گڑے مردے مت اکھاڑو۔ حالانکہ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو گڑے مردوں کو اکھاڑیں گے نہیں بلکہ ہماری مطالعہ تاریخ سے بہت سے نیک طبع مردے زندہ ہو جائیں گے ۔اور یوں وہ ہماری تاریخ پر پڑی ہوئی بہت سے گرد کو دور کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔ تاریخ کا مطالعہ ہمارے تعصبات کو جلا نہیں بخشتا بلکہ ہمارے تعصبات کو دور کرتا ہے۔ ہمارے دلوں میں عدل و انصاف کی فصل بوتا ہے۔ ہمارے ماضی و حال کو مستقبل تک شاندار طریقے سے پہنچانے کا باعث بنتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اہل ظلم نے شہیدان کربلا کے دلوں کے شیشوں کو اس لئے توڑا تھا کہ اہل عدل کے کانوں کی سماعت جاتی رہے۔ لیکن اہل ظلم کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی ان کے کانوں کی یعنی اہل درد اور اہل عدل کے کانوں کی سماعت کو کربلا والوں کے دلوں کے شیشوں نے ٹوٹ کر ایسی ایسی آوازیں سننے کے قابل بنا

دیا جن آوازوں کو سننے کی تاب گوش ہائے انسانیت لا ہی نہیں سکتے تھے۔ اور اس ضمن میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب دلوں کے شیشے ٹوٹتے ہیں تو گوش انسانیت روح انسانیت کو اس طرح جھنجھوڑتے ہیں کہ بیداری کا ایک نیا عالم ظہور میں آتا ہے۔ اور بیداری کا یہ عالم کیا ہوتا ہے۔

دراصل یہ ہمدردی کا عالم ہوتا ہے اور جب آدمی ہمدردی کے عالم میں ہوتا ہے تو پھر اس کے غور و فکر کے دھارے بھی بدل جاتے ہیں یعنی پھر آدمی صرف اپنے بارے میں غور و فکر سے کام نہیں لیتا۔ دنیا کے دوسرے لوگوں کی بھلائی کے لئے بھی تیار ہو جاتا ہے۔ آدمی جس وقت بیدار اور ہمدرد ہوتا ہے دراصل اس وقت وہ خیر کثیر کے ایسے خزانے کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ جس کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے ہیں۔ کہ ان دروازوں سے وہ جس قدر بھی چاہے دولت سمیٹ سکتا ہے۔

دراصل شعر زیر بحث میں میر انیس دلوں کے شیشوں کو ٹوٹنے کی بات کر کے صرف ان دلوں کے شیشوں کی نزاکت ہی کا ذکر نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ اصل بات یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ درد مند بننے کے لئے انسان کو آنکھیں کھول کر جینا ہوتا ہے۔ جو لوگ آنکھیں کھول کر زندگی نہیں گزارتے ان کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ وہ صاحب درد نہ ہونے کے واسطے سے مفلس اور نادار ہو جاتے ہیں۔ بے درد آدمی ہزار دنیاوی مال و دولت کے باوجود مفلس اور نادار رہتا ہے۔ کہ بے دردی کے باعث اس کی زندگی کی رونق ہی ختم ہو جاتی ہے۔ دردمندی انسان کی زندگی میں رونق پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا آدمی کو درد مند بننے کے لئے از خود کوشش کرنی چاہئے۔ اور جب آدمی درد کو خود خریدتا ہے تو پھر اس کے درد میں آسودہ حالی کی عجیب عجیب متمول کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو آدمی کو زندگی کے نئے نئے عوالم کی سیر کراتی ہیں۔

شکر اور لہو کی فضائے بسیط

(میر انیس کے سلام کے ایک شعر کے حوالے سے)

میر انیس نے اپنے سلام کے ایک شعر میں شکرگزاری کی ایک بہت ہی مضبوط اور اعلیٰ انسانی صورت حال سانحۂ کربلا کے حوالے سے پیش کی ہے جس کے مطالعہ سے نہ صرف انیس کی شاعرانہ بصیرت کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس کے اس انسانیت افروز عقیدے سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے جو پوری انسانیت کی بھلائی کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ مزید گفتگو سے پہلے انیس کے سلام کا وہ شعر ملاحظہ فرمائیے جس کے بارے میں مجھے بات کرنی ہے۔

شکر ہی شکر نکلتا تھا لہو کے بدلے
دہنِ زخمِ بدن دیدۂ خونبار نہ تھے

امام حسینؑ کا بدن زخموں سے چور تھا لیکن دہن زخم یعنی زخموں کے منہ سے خون نکلنے کی بجائے شکر شکر کی آواز نکل رہی تھی۔ امام حسینؑ ایک عظیم مقصد کے پیش نظر یہ سب ظلم وستم برداشت کر رہے تھے۔ مقصد سامنے ہو تو انسان کے روح و بدن دونوں میں ایک عجیب شان کی صلاحیت و طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔ بلکہ

یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ مقصد انسان کی روح و بدن کو ایک کر دیتا ہے۔ روح میں بدن سمٹ کر آ جاتا ہے اور بدن اپنی جگہ سراپا روح بن جاتا ہے۔ ایک دوسرے میں شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس میں عام انسان کی آنکھ کو صاحبانِ مقصد نورانی لوگ نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ عام لوگوں کو نور سے بنے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ صورت حال کسی طرح کے مبالغے کی صورت حال نہیں ہوتی۔ اہل مقصد کے سامنے مبالغہ نہ کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ اور نہ کوئی معنی۔ گویا انسان کا عمل مبالغے کو اپنے آپ میں اس طرح جذب کر لیتا ہے۔ کہ پھر مبالغہ معمول بن جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ جب انسان کے سامنے کوئی مقصد ہوتا ہے پھر اچھائی اور برائی کے جملہ امکانات اس کی نظروں کے سامنے اس طرح آ جاتے ہیں۔ کہ خیر و شکر کی جملہ انتہائیں ایک قدم کے فاصلے سے زیادہ نظر نہیں آتیں۔ مقصد کے زور پر وہ کسی انتہا کو بھی آسانی کے ساتھ چھو سکتا ہے۔ بس دعا یہ کرنی چاہئے کہ انسان کا مقصد خیر و خوبی کی اساس پر قائم ہو۔ جی ہاں اکثر انسان کا مقصد شر کی اساس پر ہوتا ہے۔ وہ اس لئے کہ ایسے مقصد پر غور و خوض سے کام نہیں لیا گیا ہوتا۔

شکر کے معنی آنکھیں بند کر کے کسی بات کو تسلیم کرنا ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ شکر میں غور و فکر کی اتنی بلندیاں اور گہرائیاں ہوتی ہیں۔ کہ جب انسان شکر کے عالم میں آتا ہے۔ تو پھر اس کی قوت و طاقت کا اندازہ لگانا عام آدمی کے بس کا روگ نہیں رہ جاتا۔ شکر کے عالم میں انسان کے جذبات بھی اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے ہیں۔ یعنی شکر کے عالم میں جذبات کے تمام طاقتوں اور قوتوں کی لگامیں شکر ادا کرنے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ عقل و خرد اور جذبات کی عمدہ ترین آمیزش اگر کہیں دیکھنی ہو تو کسی انسان کو شکر کے عالم میں

دیکھا جائے تب صحیح معنی میں پتا چلتا ہے کہ شکر کہتے کس کو ہیں۔ عقل و خرد اور جذبات کی معتدل آمیزش ہی کے باعث شکر کے عالم میں انسان کی تگ و دو کا عالم بھی دیدنی ہوتا ہے۔ عالم شکر میں انسان کے تفاعل کا عالم ایک عجیب انداز کے ٹھہراؤ میں ہوتا ہے۔ کہ جس میں جلال و جمال کی کیفیات اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔ انیس کے مراثی میں شکر کے عالم کی یہ فضا اکثر و بیشتر آپ کو نظر آتی ہے۔ امام حسینؑ کے رفقا کے بارے میں انیس اپنے ایک مرثیے میں فرماتے ہیں۔

اک اک جری کو نشہ جرات کا جوش ہے
عالم ہے بے خودی کا پہ مرنے کا ہوش ہے

ایک طرف عالم بے خودی اور دوسری طرف مرنے کا ہوش یہ ایک عجیب صورت حال ہے لیکن یہ صورتِ حال شکر کے عالم میں ایک معمول کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ میر انیس کے ایک مرثیے کا آغاز کا یہ مصرع بہت مشہور ہے۔ آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے۔ اس میں امام عالی مقام کو زخموں سے چور دکھایا ہے۔

گیسو آلودۂ خوں لپٹے ہیں رخساروں سے — شانے کٹ کٹ کے لٹک آئے ہیں تلواروں سے
تیر پیوست ہیں خوں بہتا ہے سوفاروں سے — لاکھ آفت میں ہے اک جان دل آزاروں سے

لیکن ایسی صورت میں بھی امام عالی مقام کا یہ حال ہے۔

فکر ہے سجدۂ معبود میں سر دینے کی

اسی مرثیے کا ایک بند ہے۔

گرتے ہیں قطرۂ خوں زخم جبیں سے پیہم — دست مجروح سے کھینچ سکتے نہیں تیر ستم
فکر ہے بخشش امت کی کچھ اپنا نہیں غم — کرتے ہیں شکر خدا خشک زباں سے ہر دم

حضرت زینب جب دیکھتی ہیں کہ ان کا بھائی شہید ہو رہا ہے۔ تو خیمہ گاہ سے نکلتی ہیں۔ فوج اشقیا کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں تو اس پر امام حسینؑ فرماتے

ہیں۔ کس کو سمجھاتی ہو کوئی نہ سنے گا فریاد۔

اور آخر میں بہن سے فرما رہے ہیں جاؤ گھر میں مجھے امت پہ فدا ہونے دو

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ایسی امت کی بخشش کی دعا کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ جس امت کو اپنے نبی کے نواسے اور اس کی اولاد کا کوئی خیال نہیں کہ کس بات کے لئے ظلم وستم کیا جا رہا ہے۔ امام حسین اور ان کے رفقا کے ساتھ یہی جھگڑا تھا نا کہ وہ ایک فاسق و فاجر کی بیعت نہیں کر رہے تھے۔ امام حسینؑ کیوں نہیں بیعت کر رہے تھے؟ اگرچہ اس سوال کا جواب ہم پہلے ہی دے چکے ہیں کہ بیعت طلب کرنے والا فاسق و فاجر تھا اور امام حسینؑ کا اس کی بیعت کرنا ایسا ہی تھا کہ فسق و فجور کی کھلی چھٹی مل جاتی۔ اسلام کی صورت مسخ ہو جاتی ہے۔ دین اسلام کہ جو پوری دنیائے انسانیت کے لئے ایک خیر سے بھرپور لائحہ عمل ہے وہ اپنی اصل پر قائم نہ رہتا۔ اور دین اسلام کا اپنی اصل پر قائم نہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی جگہ انسان نہ رہتا وہ اپنی انسانیت کھو بیٹھتا۔ آج بھی جو انسانیت کا صحیح معنی میں ارتقا رک رہا ہے اس کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ انسان مادی اعتبار سے ترقی نہیں کر رہا ہے وہ یقیناً مادی اعتبار سے ترقی کر رہا ہے لیکن مادی ترقی کا مطلب انسان کی حیوانیت کے لئے زیادہ سودمند ہے نہ کہ اس انسانیت کے لئے جس میں انسان کی حیوانیت کو سب کچھ نہیں سمجھا جاتا مادی ترقی تو انسان کے انسان ہونے کو محض ایک خواب قرار دیتی ہے۔

یہاں پھر یہ سوال اٹھایا جاسکتا کہ امام حسینؑ کی قربانی سے آج کہاں انسانیت کا بول بالا ہے۔ آج بھی انسان اپنی حیوانیت کے لئے ہی سب کچھ کر رہا ہے۔ فسق و فجور اور ظلم وستم کا وہی حال ہے جو پہلے تھا۔ اس ضمن میں ہم اور کچھ نہ کہیں اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ امام حسینؑ نے ظلم وستم کے خلاف بہت مضبوط آواز

اٹھائی جس نے باشعور لوگوں کے دلوں میں ظلم وستم کے خلاف کم از کم نفرت ضرورت پیدا کر دی ہے۔ آج ظالم ہزار اپنے ظلم وستم کے لئے جواز پیدا کرے اس کے ضمیر کی آواز پھر بھی اپنا ایک اثر ورسوخ رکھتی ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ امام حسین کو ظلم وستم کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کے لئے اپنا بہت کچھ قربان کرنا پڑا۔ اور اس کے لئے امام حسین کو بڑا حوصلہ بھی دکھانا پڑا جس کی ابھی تک دنیا میں کوئی دوسری مثال ہمارے سامنے نہیں لا سکا۔

شعر زیر بحث ہی کو دیکھ لیجئے۔ ظالم لوگ امام حسین کے جسم کو چھلنی چھلنی کئے جا رہے تھے۔ اور امام ان کو مجموعی طور پر امت کی صورت میں سنور جانے کی تلقین کر رہے تھے۔ ان کی بھلائی کے امکانات پر نہ صرف امام غور کر رہے تھے۔ بلکہ اپنا حوصلہ دکھا کر ان کے لئے علاج بھی تجویز کر رہے تھے۔ کہ انسان کو انسان کی طرف سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ آج نہیں تو کل انسان راہ راست پر ضرور آجائے گا۔ راہ راست پر آنا اور دنیا میں خیر وخوبی کا بول بالا ہونا ایک مقدر ہے۔ جس کو ایک نہ ایک دن بروئے کار ضرور آجانا ہے۔ انسان کی طرف سے پر امید رہنا بھی ایک ایسا عظیم درس ہے جو امام حسین نے پوری دنیا کو نہایت بلند حوصلگی اور بلند آگاہی کے ساتھ دیا جس کا عرفان ابھی تک دنیا کو پوری طرح نہیں ہوا لیکن یہ عرفان انسان کو ہو کر رہے گا۔ آگاہی اور علم و دانش کی طرف انسان کے قدم پوری طرح ضرور اٹھیں گے۔

میں شعر زیر بحث کو ایک بار پھر ذیل میں لکھ رہا ہوں تا کہ اس پر ہماری توجہ پوری طرح مبذول ہو سکے۔

شکر ہی شکر نکلتا تھا لہو کے بدلے
دہنِ زخم بدن دیدۂ خونبار نہ تھے

بہت واضح سی بات ہے کہ بدن کے زخم سے تو خون ہی نکلنا چاہئے تھا لیکن امام حسین اور ان کے رفقاء کے بدنوں سے خون کی جگہ شکر نکل رہا تھا۔ یعنی امام حسینؑ نے اپنی روحانی طاقت کو اس قدر مضبوط کر لیا تھا۔ کہ پھر ان کے جسم کے خون نے شکر کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن میر انیس شعر زیر بحث میں ایک اس سے بھی باریک نکتہ پیدا کر رہے ہیں۔ وہ فرما رہے ہیں کہ جسم کے زخم کے منہ سے لہو کس طرح نکل سکتا تھا لہو کے نکلنے کی جگہ تو آنکھ ہوتی ہے جو خون کے آنسو روتی ہے۔ لیکن اس باریک نکتے کو سمجھنے کے لئے پہلے خون کے آنسو کیا ہوتے ہیں یا خون کے آنسو رونے کا مطلب کیا ہے اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے کسی کی آنکھ کا خون کے آنسو رونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے کسی تکلیف کو بڑی شدت ہی کے ساتھ محسوس نہیں کیا بڑی بصیرت کے ساتھ بھی محسوس کیا ہے۔ گویا امام حسینؑ پر جو امت کے لوگ ظلم ڈھا رہے تھے اسے امام مظلوم ان لوگوں کی نادانی کے طور پر لے رہے تھے لیکن اس نادانی سے امام کو تکلیف بھی بہت پہنچ رہی تھی۔ اپنی اس شدید تکلیف کے احساس کو اگر منفی طور پر لیتے تو وہ ظالموں کے حق میں بد دعا بھی کر سکتے تھے لیکن امام نے بد دعا کے بدلے شکر کے احساس کو اپنے دل میں جگہ دی یعنی بد دعا دینے سے تو حالات اور خراب ہو سکتے تھے اس لئے امام مظلوم نے اس پر شکر ادا کیا کہ خدا نے موصوف کو کس قدر مضبوط دل عطا کیا ہے کہ وہ تمام ظلم وستم کے باوجود ظالموں کے سنور جانے کے خواہشمند ہیں۔ ان کے لئے خیر وخوبی کے خواہاں ہیں۔ اس طرح امام نے اپنی جسمانی تکلیف کو ایک مثبت انداز میں لے کر ایک عظیم انسانیت افروز درس سے انسانیت کے لئے خیر وخوبی کا انتظام کر دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امام کو ذہنی اور جسمانی تکالیف کا احساس نہیں تھا۔ اسی لئے خون بہانے کے لئے میر انیس نے دیدۂ خونبار کی ترکیب استعمال کی

ہے۔ یعنی امام نے ان تمام دکھوں کو نہایت گہری بصیرت کے ساتھ اپنے آپ پر لیا ہے۔ امام کے بدن کے زخموں سے خون کے بدلے شکر ضرور نکل رہا تھا۔ لیکن ان کی آنکھیں خون کے آنسو رو رہی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم زیر بحث شعر کی تفہیم اس طرح بھی کر سکتے ہیں۔ کہ امام نے جہاں اپنی جسمانی تکلیف یعنی بدن کے زخموں کو روحانی طور پر اس قدر لطیف کر دیا تھا۔ کہ ان کے بدن کے زخموں سے خون کے بدلے شکر نکل رہا تھا۔ اور اس شکر نے ٹھوس صورت اختیار کر لی تھی وہاں امام نے اپنی آنکھوں سے خون کے آنسو رواں کر کے یہ بھی بتایا کہ ان کے جسم کے تکلیف بھی کوئی تکلیف نہ تھی۔ امام کو عام لوگوں کی نسبت کہیں بڑھ کر کہیں زیادہ اپنے جسم کے زخم محسوس ہو رہے تھے۔ گویا کربلا میں شہداء پر ہر طرح کا ظلم ہے۔ روحانی میں اور جسمانی بھی۔ لیکن امام نے ان دونوں طرح کے دکھوں کو اپنے شخصی کردار کی طاقت و توانائی کے باعث انسانیت کے بہت بڑے دکھوں میں تبدیل کر دیا۔

امام حسین کا اندازِ شکر انسان کی ایک بہت عظیم صلاحیت کی طرف واضح اشارہ ہے۔ اور وہ عظیم صلاحیت یہ ہے کہ سچا انسان اپنی بڑی سے بڑی تکلیف کو انسانی ارتقا کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتا۔ بلکہ اس کے برعکس یہ دکھ اور یہ تکلیف تو اس کے ارتقاء میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جی ہاں دیکھ لیجئے اسی لئے شعر زیر بحث کی روشنی میں امام حسینؑ نے اپنے جسم کے ایک ایک زخم کو معرفت حق کا وسیلہ بنا لیا تھا۔ ان کے ایک ایک زخم سے خون کے بدلے شکر کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ امام حسین کے شکر کرنے سے علم و عرفان کی ایسی ایسی صبحیں طلوع ہو رہی تھیں جن کے اجالوں کا عرفان دنیا کو قیامت تک ہوتا رہے گا۔ اس حقیقت کو جلدی سے سمجھنا آسان نہیں ہے کہ ظالم اپنے ظلم و ستم کی انتہا پر پہنچا ہوا

ہے لیکن مظلوم ہے کہ اس کے لئے دعائیں مانگ رہا ہے۔ بالکل عجیب سی بات نظر آتی ہے۔ لیکن امام مظلوم انسانیت کی خیر خواہی کے جس مقام شعور پر پہنچے ہوئے تھے اس کی بلندی کا اندازہ امام عالی مقام کی اسی وسعت حوصلہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ وہ اپنی شدید ترین تکالیف کو ایک طرف رکھ کر امت کی بھلائی کے خلوص دل سے خواہاں تھے۔ امام کے شکر کا ایک پہلو یہ بھی قابل غور ہے کہ امام شکر ادا اپنے اس عزم و ہمت کے حوالے سے بھی کر رہے تھے کہ نادان امت کی نادانی کو وہ سمجھ رہے تھے اور پوری طرح سمجھ رہے تھے یعنی اللہ نے انہیں امت کی نادانی کو سمجھنے کا شعور پوری طرح عطا کر رکھا تھا۔ جس کے لئے وہ باری تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے۔ امام عالی مقام کو اپنے مقابل کے لوگوں کی ناسمجھی اور ندانی کے شعور کے ساتھ یہ احساس بھی تھا کہ کہیں یہ نادان لوگ ہمیں کمزور نہ سمجھ لیں چنانچہ میر انیس نے امام حسینؑ اور ان کے رفقا کی جو جنگ دکھائی ہے اس میں بھی انیس نے نہ صرف اپنی شاعری کا ہنر دکھایا ہے بلکہ انسانی نفسیات کے حقائق کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ امام حسینؑ کے مقابل چونکہ ایسے لوگ تھے جنہیں نہ صرف امام حسین کی معرفت نہ تھی بلکہ خود اپنے انسان ہونے کا احساس بھی نہ تھا۔ جس کے باعث وہ اندر سے بزدل تھے۔ اسی لئے امام حسین کی طرف سے لڑنے کے لئے ہر آنے والے سے وہ مرعوب ہوتے تھے۔ اور جب امام مظلوم سامنے آئے تو ان کا مرعوب ہونا عین فطرت کے مطابق تھا۔ سب عزیز و اقارب اور دوست شہید ہو چکے ہیں امام خود بھی زخموں سے چور ہیں لیکن ایسے عالم میں بھی جب وہ فوج اشقیا کے سامنے آتے ہیں تو یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ چنانچہ انیس ایک مرثیے میں آمد امام کا حال لکھتے ہیں۔ اور بتا رہے ہیں فوج اشقیا کا کیا حال تھا۔

غل تھا ز ہے حسینؑ زہے شانِ حیدری دیکھی نہ یہ شکوہ نہ ایسی دلاوری
تیور سے آشکار ہے رعب غضنفری کس کی مجال ہے جو کرے ان سے ہمسری
قابو میں ایسے شیر کا آنا محال ہے
لڑنا تو کیا کہ آنکھ ملانا محال ہے

اور اب ایک دوسرے مرثیے میں امام کے شکر کی کیفیت بھی ملاحظہ فرمایئے۔ تمام عزیز و اقربا شہید ہو چکے ہیں۔ امام عالی مقام میدان جنگ میں تنہا کھڑے ہیں۔ فوج اشقیا امام کے خون کی پیاسی سامنے کھڑی ہے۔ لیکن امام عالی مقام باری تعالیٰ سے گویا ہیں۔

کس کس ترے احساں کا کروں شکر زباں سے
ہے ناطقہ عاجز کہ زیادہ ہے بیاں سے
واقف نہیں کوئی ترے اسرارِ نہاں سے
دشوار ہے عالم کی صفت ہیچمداں سے
پیاس آج کے دن کی مجھے مرغوب ہے مولا
جو تیری مشیت ہے وہی خوب ہے مولا

ہر دم ہے ترا لطف مرے حال کے شامل پیدا کیا واں وحی جہاں ہوتی تھی نازل
بخشا وہ مکاں رہنے کو اے خالق عادل بے اذن ملک جس میں نہ ہو سکتے تھے داخل
یہ لطف و عنایت ہے تری کونسے گھر پر
جبریل و سرافیل کھڑے رہتے تھے در پر

نانا تو دیا اشرف ذریت آدم بابا شہ مرداں سا دیا فخر دو عالم
ماں سیدۂ کون و مکاں ثانی مریم بھائی وہ کہ تو جس کی بزرگی سے ہے محرم

دنیا میں کسی اور کا رتبہ ہے کب ایسا
نام ایسا گھر ایسا نسب ایسا حسب ایسا

ماں طاہرہ جد طیب و پاکیزہ پدر پاک　　رحمت سے تری کیوں نہ ہو ایسوں کا پسر پاک
گلشن کی زمیں پاک شجر پاک ثمر پاک　　گھر پاک جگہ پاک صدف پاک گہر پاک
پھولے وہ شجر جس کے ثمردار کرے تو
جس قطرے کو چاہے دُرِ شہوار کرے تو

بچپن میں محمدؐ نے زباں اپنی چوسائی　　اب تک کسی نعمت میں وہ لذت نہیں پائی
قربان رہی احمدِ مختار کی جائی　　جب دودھ چھٹا نعمت فردوس بھی کھائی
افلاک سے دن میں کئی بار آتے تھے جبریل
ڈوری مرے جھولے کی ہلا جاتے تھے جبریل

شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ اپنے ماضی کو یاد کرنا بھی ہے کہ اس سے حال کی صورت کا صحیح جائزہ لینے میں مدد ملتی ہے۔ سو امام مظلوم یہی کر رہے ہیں۔ اور ماضی بعید سے ایک دم ماضی قریب کی طرف آتے ہیں جو حال کو سمجھنے میں اور شکر ادا کرنے میں مزید مددگار ثابت ہو رہا ہے۔

دولت مجھے دی گوہر عزت مجھے بخشا　　بابا کی طرح اوجِ شرافت مجھے بخشا
مسند مجھے دی تختِ امامت مجھے بخشا　　ان سب کے سوا تاجِ شفاعت مجھے بخشا
اختر کو قمر قطرے کو گوہر کیا تو نے
ذرہ تھا سو خورشید منور کیا تو نے

ماضی قریب سے مزید قریب آتے ہیں۔

انصار دیئے وہ جو پیمبر نے نہ پائے　　اصحاب وہ بخشے کہ جو حیدر نے نہ پائے
احباب وہ یک رنگ جو شبر نے نہ پائے　　لوگ ایسے کسی صاحب لشکر نے نہ پائے

تیروں سے نہ تلواروں سے منہ پھرتا تھا ان کا
خادم کے پسینے پہ لہو گرتا تھا ان کا

اس عالم شکر میں ایک التجا بھی ہے۔ جو حال و مستقبل قریب کو ملا رہی ہے۔

سجدہ تہ شمشیر یہ ناشاد نہ بھولے
سب محو ہوں دل سے پہ تیری یاد نہ بھولے

امام حسینؑ کو جب عمر ابن سعد نے اس شکر کے عالم میں دیکھا تو اسے غلط فہمی ہوئی کہ امام میں اب طاقت نہیں رہی۔ اس پر امام عالی مقام للکارتے ہیں۔

نعرہ کیا ہاں اے پسر سعد جفاکار
لے دیکھ تو ان کانپتے ہاتھوں کا کوئی وار

اس بند کی بیت ہے۔

شاید مرا رتبہ تجھے معلوم نہیں ہے
وہ کونسی شے ہے کہ جو محکوم نہیں ہے

اس سے اگلا بند ملاحظہ فرمایئے۔

حاکم ہوں میں سب خلق خدا ہے مرے تابع — میں باب اجابت ہوں دعا ہے مرے تابع
مختارِ قدر ہوں میں قضا ہے مرے تابع — آتش مری محکوم ہوا ہے مرے تابع
قبضہ ہے مرا خاک کے ہر گنج نہاں پر
جاری ہے مرا حکم رواں آب رواں پر

میں نے خصوصیت کے ساتھ مندرجہ بالا بند اس لئے پیش کئے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ فضائے شکر میں کس قدر طاقت و توانائی موجود ہوتی ہے۔ اور بدن کے زخموں سے خون کی جگہ جو شکر شکر کی صدائیں بلند ہوتی ہیں ان کی طاقت کس

طرح خون سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

انیس نے جو شعر زیر بحث میں دیدۂ خونبار ہی کے لئے خون کو وقف کر دیا ہے۔ اور بدن کے زخموں سے خون کی جگر جو شکر کے بہہ جانے یا نکلنے کا ذکر کیا ہے اس میں یہی کمال دکھایا ہے کہ آنکھ سے خون اس لئے بہتا ہے کہ انسان سب کچھ جانتے ہوئے اَن جان بن جاتا ہے تو واقعی آنکھ رکھنے والے لوگ اس انجانے پن اور ناسمجھی پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ اور یوں زندگی کی آگاہی اپنے احساس کے باعث خون کے آنسو بن کر رہ جاتی ہے۔ جبکہ اس آگاہی سے آگے قدم بڑھا کر انسان اپنے عقیدہ کے زور پر اپنے گوشت پوست والے جسم کو سراپا نور بنا لیتا ہے۔ ایسے عالم میں نہ کوئی فضائے شکر کی انتہا نظر آتی ہے اور اس فضا کے شکر کے ساتھ ساتھ جسم بھی اپنی جسمانیت اور مادیت کو چھوڑ کر نور ہی نور میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اور اسی طرح نور آنکھوں سے خون بن کر بہنا شروع کر دیتا ہے اور اس طرح لہو کے فضائے بسیط کا پتا لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر یہ سب مشکلیں اس وقت آسان دکھائی دینے لگتی ہیں جب آدمی میں شہیدانِ کربلا کی معرفت صحیح معنی میں پیدا ہونے لگتی ہے۔

شعر زیر بحث میں انیس نے جو خصوصیت کے ساتھ ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے اس کے وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ کسی مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ہم ماضی میں اس لئے چلے جاتے ہیں کہ ماضی پر غور کرتے ہوئے ہیں اور اس بوجھ کا ایک مضحکہ خیز پہلو یہ ہے کہ ہم اپنی روحانی طاقتوں ہی سے انکار کرنے لگ جاتے ہیں۔ جبکہ ہمارے انکار میں کسی شعور کے بجائے بے خبری اور گریز کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ البتہ ہم اپنے آپ کو حقیق پسند سمجھ کر ضرور خوش ہو لیتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت پسندی اس وقت ہم سے خاصہ خطرناک قسم کا مذاق کرنے کے عزم میں ہوتی ہیں۔

زمین اور آسمانوں کا شعور

(میر انیس کے ایک شعر کے حوالے سے ایک تجزیہ)

ممکن ہے آپ میری یہ بات سن کر حیران ہوں کہ جس طرح زمین اور آسمانوں کے شعور نے انسان کو خدا پرست بنایا کچھ اسی طرح زمین اور آسمانوں کے شعور نے انسان کو خدا سے منحرف بھی کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کفر اور ایمان کا منبع ایک ہی ہے۔ اگر یہ زمین اور آسمان نہ ہوتے تو انسان نہ مومن ہوتا اور نہ ہی کافر۔ اللہ پر ایمان لانے کا وسیلہ بھی یہی زمین و آسمان ہیں اور اللہ سے منحرف بھی انسان کو یہی زمین و آسمان کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ زمین و آسمان میں کفر و ایمان حلول کر گئے ہیں یا زمین اور آسمان اپنی جگہ مومن یا کافر قسم کی کوئی چیز ہیں۔ زمین و آسمان کا اس طرح کا کوئی رابطہ کفر و ایمان سے نہیں ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو غریب زمین و آسمان اس ضمن میں کنوارے ہی نہیں بالکل کورے ہیں۔ ان کو یعنی زمین و آسمان کو ان میں سے یعنی کفر و ایمان میں سے انسان کی طرح کوئی چیز کبھی چھو کر نہیں گئی۔

میر انیس اپنے طور پر اس مسئلے کو اپنے ایک سلام کے شعر کے ذریعے کچھ اس طرح حل کرتے ہیں۔ پہلے وہ شعر سن لیجئے۔

دکھا دوں زمین نجف کی بلندی
بہت آپ کو آسماں کھینچتے ہیں

اس شعر کی ابتدا جو ان دو لفظوں سے ہوتی ہے ''دکھادوں'' تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے جیسے زمین نجف کی بلندی کو دکھانا کوئی بات ہی نہیں ہے۔ بس آپ شاعر کو کہیے کہ بھئی زمین نجف کی بلندی دکھائیں اور وہ آپ کو فوراً اس بلندی کا نظارہ کرادے گا۔ شاعر میں جو یہ وثوق پیدا ہوا ہے دراصل آپ کے اس رویے سے پیدا ہوا ہے کہ آپ آسمانوں کی بلندی سے بہت متاثر ہیں۔ اس پر شاعر کہہ رہا ہے کہ اگر آسمانوں کی بلندی یا خود آسمان اپنی طرف آپ کو بہت متوجہ کر رہے ہیں تو جذبے کی اسی شدت سے مجھے یعنی شاعر کو زمین نجف کی بلندی اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے۔ آپ کو آسمان اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ جو ظاہر ہے کہ دور کی چیز ہیں تو پھر بھی شک و شبہ کی بہرصورت گنجائش موجود رہتی ہے۔ لیکن قریب کی چیز میں یہ شک و شبہ والی بات اگر کوئی ہو بھی تو اسے یعنی شک کو دور کیا جا سکتا ہے۔ غالبًا زمین نجف کی بلندی کی قربت کے باعث ہی شاعر اپنے آپ کو یقین کی منزل سے زیادہ نزدیک محسوس کر رہا ہے۔ اور اسی خیال کے تحت وہ آپ کو دعوت نظارہ یا دعوت مشاہدہ دے رہا ہے کہ آپ آسمانوں کی بلندی سے بہت متاثر ہیں اگر واقعی ایسی بات ہے تو لائیے پھر میں آپ کو زمین نجف کی بلندی دکھائے دیتا ہوں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ایک چیز بالکل سامنے کی ہے تو دوسری چیز دور ہی کی

نہیں بہت دور کی۔

ظاہر ہے زمین و آسمانوں کے شعور میں نزدیک اور دور یعنی فاصلے کے شعور کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ آپ اس ضمن میں بینائی کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ بینائی ٹھیک ہے تو دور کی چیز بھی صاف نظر آ سکتی ہے اور اگر بینائی ہی میں نقص ہے تو نزدیک کی چیز بھی صاف نظر نہیں آتی۔ لیکن بینائی یعنی بصارت کے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہے کہ آپ کی ظاہر کی آنکھیں کتنا بھی اچھا کام کرنے کی اہل ہوں وہ دور کی چیز کو دکھا تو سکتی ہیں لیکن اس دور کے چیز کو آپ کے نزدیک نہیں لا سکتیں۔ ادھر مخلوقات میں اشرف المخلوقات حضرت انسان کی تسلی اور تشفی اسی وقت ہوتی ہے جب وہ کسی چیز کو اپنے قریب لے آتے ہیں۔ دراصل انسان ہر شے کی قربت کا اس لئے خواہاں رہتا ہے کہ وہ ہر چیز کو جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے۔ اسے ہر چیز کی معرفت حقیقت عظمیٰ کی معرفت کے قریب لاتی ہے۔ یہ سب کچھ لاشعوری طور پر ہوتا ہے۔ اور اسی لئے اس علم و آگہی کے عمل میں ہر انسان کو شامل سمجھئے۔ میر انیس نے اپنے شعر زیر بحث میں علم و آگہی کے اسی عمل پر زور دیا ہے جیسا کہ میں ابتدا ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ پہلے مصرع کے شروع کے دو لفظ ''دکھادوں'' نہ صرف اس ضمن میں یقین کا اظہار کر رہے ہیں بلکہ اس عمل کی تیزی اور تعجیل کی طرف واضح اشارہ کرنے کے موجب بنے ہوئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جب انیس یہ فرماتے ہیں ''دکھادوں زمین نجف کی بلندی'' تو اس سے یہ پتا چل رہا ہے کہ زمین نجف کی بلندی دکھانا ایک تو کوئی مشکل کام نہیں ہے دوسرے اس بلندی کو دکھانے میں کوئی دیر بھی نہیں لگتی۔ بس

دیکھنے والے کو دیکھنے کے لئے تیار رہنے کی ضرورت ہے۔ زمین نجف کی بلندی کو دیکھنے کے لئے کس قسم کی تیاری ضروری ہے یعنی دیکھنے والے کو کس طرح تیار رہنا چاہئے تو اس کے جواب میں میری گذارش یہ ہے کہ اس میں دیکھنے والے کی معمولی سی توجہ درکار ہے پھر آپ یہ بھی فرما سکتے ہیں کہ دیکھنے والا توجہ کیوں نہیں دے گا۔ اس کی توجہ کیا کہیں دوسری طرف لگی ہوئی ہے۔ جی ہاں توجہ ہی کا سارا مسئلہ ہے خود انیس کے اس شعر زیر بحث میں یہ بات واضح ہو رہی ہے جب ہم دوسرا مصرع پڑھتے ہیں بہت آپ کو آسماں کھینچتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی توجہ تو آسمانوں کی طرف ہے۔ کیونکہ آپ سمجھ رہے ہیں کہ بلندی تو آسمان میں ہے۔ زمین پر بلندی کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہاں آپ اس حقیقت کو فراموش کر رہے ہیں کہ ہر بلندی ک ابتداء نیچے سے جی ہاں زمین ہی سے شروع ہوتی ہے۔ البتہ بلندی کی طرف جاتے وقت جس زمین سے آپ اوپر کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ اس پر اچھی طرح نظر ڈال کر اندازہ لگا لیں کہ یہ زمین مضبوط بھی ہے۔ انیس اپنے اس زیر بحث شعر میں دراصل یہ سمجھا رہے ہیں کہ زندگی کی جتنی بلندیاں ہیں وہ انسان کی ذات کے اندر موجود ہیں۔ آسمانوں کی بلندیاں تو صرف اندر کی بلندیوں کا احساس دلانے کے لئے ہیں ۔ اور یوں زمین و آسمانوں کا شعور دراصل آپ کی ذات کے اندر کے شعور کو بیدار کرنے کا ایک ذریعہ قرار پاتا ہے۔ اور پھر ایک لطف کی بات بھی اور حیرت کی بات بھی یہ ہے کہ جس طرح آسمانوں کی بلندیوں تک پہنچنا ایک مشکل کام ہے بلکہ اب تو جتنا کچھ آسمانوں کے بارے میں علم حاصل ہوتا جا رہا ہے اس سے تو یہی اندازہ لگ رہا ہے کہ اس ظاہر کی دنیا کی بھی کوئی حد نہیں ہے اور اس کی حد تک پہنچنا ایک طرح ناممکن ہی سمجھ لیجئے۔ کہکشائیں

روز بروز بلکہ لحہ بہ لحہ پھیلتی جا رہی ہیں اسی نسبت سے آسمانوں کی بلندیاں بھی بڑھتی جا رہی ہیں اور ارب کھرب میلوں سے بھی ان آسمانوں کا فاصلہ ہماری زمین سے دور فاصلہ ہے لیکن وہی بات کہ حیرت اور خوشی کا مظہر تو یہ ہے کہ باہر کی یہ کائنات اور باہر کے یہ آسمان ہمارے اندر کی کائنات اور ہمارے اندر کے آسمانوں سے پھر بھی زیادہ نہیں ہیں۔ انسان کی ذات کے اندر کی کائنات باہر کی کائنات سے پھر بھی زیادہ ہے لیکن یہ پھر ایک حیرت اور مسرت کی بات ہے کہ اندر کی دنیا باہر کی دنیا سے کتنی بھی وسیع کیوں نہ ہوں انسان کی رسائی اور پہنچ کے اندر ہے یعنی باہر کی دنیا اور اس کے آسمانوں تک انسان کبھی پہنچ سکے یا نہ پہنچ سکے لیکن اپنے اندر کی اس سے بھی وسیع ترین دنیا میں وہ جب چاہے داخل ہو سکتا ہے اور صرف داخل ہونے تک ہی بات محدود نہیں ہے اندر کی دنیا کے آسمانوں تک بھی اس کی رسائی نہایت آسانی کے ساتھ ممکن ہے۔

باہر کی دنیا انسان کی پہنچ سے دور ہے اسی لئے کہ باہر کی دنیا اس قابل ہے بھی نہیں کہ آدمی اس تک پہنچنے کے لئے خوامخواہ اپنے آپ کو خستہ و خراب کرے۔ یہ زمین اور آسمان یہ اسکی وسعتیں اور بلندیاں تو محض انسان کو اس کے اندر کے زمین و آسمان کی بلندیوں اور وسعتوں کا شعور بخشنے کے لئے ہیں۔مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں باہر کی دنیا اور زمین و آسمان کی حیثیت کا منکر ہوں۔ ان کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ اور اس اہمیت کے بھی ان گنت پہلو ہیں جن میں میری دانست میں یہی پہلو سب سے عظیم ترین پہلو ہے اور یہ پہلو کونسا کم پہلو ہے کہ باہر کی دنیا انسان کو اس کی ذات کے اندر کی دنیا کا شعور دلاتی ہے۔ اگر یہ باہر کی دنیا نہ ہوتی تو آدمی کو اس کے اندر کا شعور کیسے حاصل ہو سکتا اور اس طرح

علم و عرفان کا سارا وسیلہ ہی یہ باہر کے زمین و آسمان ٹھہرتے ہیں۔

میر انیس اپنے زیر بحث شعر میں آپ سے صرف یہ درخواست کرتے ہیں اگرچہ ان کی اس درخواست میں بھی ایک عجیب طرح کی اپنایت اور یگانگت کا طمطراق موجود ہے کہ آپ باہر کی دنیا سے متاثر ہو رہے ہیں۔ تو ایک حد تک ضرور متاثر ہوں لیکن حد سے زیادہ متاثر ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ باہر کی دنیا سے اس زمین و آسمان سے بہت زیادہ متاثر ہو رہے ہیں۔ یعنی اس حد تک متاثر کہ آپ کو ان آسمانوں نے اپنی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا ہے۔ گویا آپ ان سے بہت مرعوب ہوئے جا رہے ہیں اتنے مرعوب کہ گویا آپ ان کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں اور آپ اپنے آپ کو سنبھالنے کے بھی قابل نہیں رہے تو لائیے میں آپ کو زمین نجف کی بلندی دکھاتا ہوں ۔ پھر آپ کو معلوم ہو گا کہ ان آسمانوں کی اتنی حیثیت نہیں ہے کہ یہ آپ کو گرا کر گھسیٹنا شروع کر دیں وہی بات کہ انسان کے اندر جو عالم اصغر ہے وہ باہر کے عالم اکبر سے کہیں زیادہ عظیم بھی ہے اور کہیں زیادہ قابل اعتبار بھی۔

یہ اعتبار والی بات بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ آدمی کی سائنٹیفک یعنی سائنسی سوچ باہر کی دنیا کو زیادہ قابل اعتبار سمجھتی ہے جبکہ انسان کی خالص سوچ یعنی انسانی سوچ اندر کی دنیا کو قابل اعتبار سمجھتی ہے لیکن انسانی سوچ کی بڑائی یہ ہے کہ وہ باہر کی دنیا کو بھی ایک حد تک قابل اعتبار سمجھتی ہے۔ اس لحاظ سے انسانی فکر ہمیں زیادہ اعتدال اور توازن میں رکھتی ہے اور انسان کے بہت سے المیوں میں ایک المیہ یہ بھی ہے کہ انسان اپنی انسانی سوچ کو عموماً اپنے ہاتھ سے گم کر بیٹھتا ہے میر انیس اپنے شعر زیر بحث میں اسی انسانی سوچ کی طرف اشارہ کرکے فرما رہے

ہیں دکھا دوں زمین نجف کی بلندی۔

اب اصل مطلب کی طرف بھی آ جائیے ۔ یہ زمین نجف کہاں ہے؟ ظاہر ہے نجف میں ہے اور اس زمین نجف کی یہ بلند و بالا حیثیت کس وجہ سے قائم ہوئی؟ اس وجہ سے کہ اس زمین میں علیؑ ابن ابی طالب کا مرقد ہے مزار ہے۔ اور یہ تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ ایک دفعہ حضرت علیؑ زمین پر لیٹے ہوئے تھے اتنے میں آنحضرتؐ تشریف لائے تو حضرت علیؑ کو خاک آلودہ دیکھ کر انہیں ابو تراب کا لقب عطا فرمایا۔ ابو تراب یعنی مٹی کا باپ زمین اور خاک کو یعنی پوری کائنات کو سمجھنے والا ۔ اس پر اپنی حکمت سے حکم چلانے والا۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؑ اس کائنات کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس دنیا کی مادیت کو سمجھنے کے لئے علی کو سمجھنا ضروری ہے اور پھر بات یہاں تک ہی نہیں ٹھہر جاتی اطاعت رسولؐ کا بھی علی کو شرف بے بہا حاصل ہے۔ یعنی حضرت علی نے اسوۂ حسنہ کو پوری طرح اپنایا۔ اسی لئے تو اقبال کہتے ہیں ۔ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف۔ اصل میں خود علی کی فطرت اور پھر اس پر پیروئ رسولؐ نے علی کے کردار میں صاف گوئی، سادگی اور حق تک پہنچنے کی صلاحیت کی تمام جوہر کوٹ کوٹ کر بھر دیئے تھے۔ چنانچہ میر انیس کے شعر زیر بحث میں حصول علم کے ضمن میں، اعلیٰ انسان اقدار کے اپنانے کے ضمن میں جو ایک آسانی کا پہلو نمایاں ہے اس میں یہی دعوت فکر و عمل ہے کہ علی کا کردار ہر ذی شعور انسان کے لئے نہ صرف نمونہ علم و عمل ہے بلکہ علی کے کردار سے محبت کر کے ہم اپنے کردار کو بہت جلد اعلیٰ درجات کے منزل پر پہنچا سکتے ہیں۔ کائنات کے آسمان یا ظاہر کے پیچھے بھاگنے والے لوگوں کی جو چمک دمک ہے وہ علی کے کردار کی سادگی کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ آپ ذرا

ہمت دکھائیں آپ علی کی ذات سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

مگر انسان کے مزاج کی یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ وہ سیدھی سادی باتوں کو سمجھنے سے عموماً گریز کرتا ہے۔ غالباً اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ صاف ستھری اور سیدھی سادی باتوں کو اپنی جگہ اس قدر آسان سمجھتا ہے کہ ان کی طرف اسے جس قدر متوجہ ہونا چاہئے اس قدر متوجہ نہیں ہوتا جبکہ صورت حال کی حقیقت یہ ہے کہ سیدھی سادی اور صاف ستھری باتیں ہی انسان کے لئے سوچنے اور سمجھنے کی ہوتی ہیں۔ ہر پیچیدہ اور گنجلک بات اگر بغور دیکھا جائے تو قابل توجہ نہیں ہوتی۔ مگر چونکہ انسان کی فطرت میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت موجود ہے وہ اسے خواہ مخواہ بھی غور کرنے اور توجہ دینے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کے صاف ستھرے کردار جس قدر قابل قدر قابل قدر اور قابل توجہ ہوتے ہیں۔ اتنے الجھے ہوئے اور پیچیدہ کردار قابل توجہ نہیں ہوتے لیکن انسان اپنی فطرت سے مجبور ان الجھے ہوئے اور منافقت سے بھرپور کرداروں کو خواہ مخواہ اپنی توجہ کا مرکز بناتا ہے۔ اور اسی لئے معاشرے میں فساد برپا ہوتا ہے اور خیر و برکت سے معاشرہ محروم رہتا ہے۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالب کا کردار چونکہ صاف ستھرا ہونے میں اور منافقت سے قطعی طور پر پاک ہونے میں صدق و صفا کے انتہائی نقطوں کو چھو رہا تھا۔ اس لئے حضرت علیؑ کو سمجھنے میں لوگوں نے اکثر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ حضرت علی سے محبت کرنے والے بھی حضرت علی کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے۔ ایسی صورت حال میں آپ خود بتایئے علی سے بغض رکھنے والوں سے آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں۔ سارا مسئلہ یہ ہے کہ علی کو سمجھنے میں آپ کسی قسم کے تناؤ اور ٹن شن کا شکار نہ ہوں ۔ علی کو اس طرح سمجھیں جیسے آپ اپنے گھر کے کسی بہت ہی پیارے کردار

اور ہر فرد کا بھلا چاہنے والے شخص کو سمجھتے ہیں جیسے وہ آپ کے گھر کا ایک نارمل کردار بھی ہے اور تمام گھر کا محبوب کردار بھی ۔ مگر وائے ہماری تقدیر اور امت مسلمہ کی قسمت کہ جس قدر علی کا کردار صاف اور ستھرا تھا اسی قدر اسے ایک معمہ سمجھ لیا گیا ۔علی کا کردار تو اسلام کی اور اسلام کی بھی کیا وسیع معنی میں انسانیت کی ایسی کھلی کتاب ہے جسے کوئی جب چاہے پڑھ سکتا ہے ۔ ہاں کھلی کتاب کے ساتھ ایک مشکل یہ ضرور ہوتی ہے کہ جتنی کوئی کتاب کھلی ہوتی ہے اتنی ہی اس میں سوچنے سمجھنے کی دعوتوں کے دعوت نامے موجود ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے دعوت ناموں میں وقت اور جگہ کا تعین بھی ہوتا ہے اور پھر جب کوئی دعوت نامہ ہم تک پہنچ جاتا ہے تو ہم پر یہ فرض بھی عائد ہو جاتا ہے۔ ہم اس کے وقت مقررہ اور مقام پر پہنچیں بھی۔ ادھر ہماری سہل انگار طبیعت سب کچھ کسی تگ و دو کے بغیر حاصل کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ علی کے کردار کو سمجھنے کے ضمن میں یہی ہوا کہ اس کردر کی طرف سے جو گوناگوں طرح کی دعوت فکر کے دعوت نامے پہنچے انہیں لوگوں نے کھول کر ہی نہیں دیکھا۔

میر انیس اپنے شعر زیر بحث میں یہی دعوت دے رہے ہیں کہ ذرا زمین نجف کی طرف قدم بڑھا کر تو دیکھیں آپ کو بہت کچھ حاصل ہوگا اتنا کچھ کہ آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے کیونکہ آپ کی نگاہیں تو آسمانوں کی طرف ہیں جن کی بلندیاں آپ کو خواہ مخواہ مرعوب کر رہی ہیں اور آپ ان بلندیوں کی طرف نہیں دیکھ رہے ہیں۔ جن تک آپ کی رسائی ہوسکتی ہے۔ اور نسبتاً آسانی کے ساتھ اور کسی تاخیر کے بغیر بھی۔

ذیل میں میر انیس کے ایک مرثیے میں سے چند اقتباسات پیش کر رہا

ہوں ۔ یہ مرثیہ حضرت علیؑ کی شان میں ہے۔ شان میں میری مراد ان کی مدح میں اور ان کی شہادت سے ہے لیکن میں تو یہ مرثیہ علی کے حوالے سے زمین اور آسمانوں کے شعور سے متعلق بات کرنا چاہتا ہوں۔ یعنی اس مرثیے کے اقتباسات کے حوالے سے کہ حضرت علی کی شان کس انداز کی ہے اور اس شان میں زمین اور آسمانوں کا شعور کس طرح سمایا ہوا ہے۔ کسی نظام شمسی میں سب سے اہم چیز سورج ہوتا ہے۔ چنانچہ مرثیہ کا آغاز سورج کے ذکر سے ہو رہا ہے۔

خورشید حقیقت رخِ زیبائے علی ہے

میر انیس فرماتے ہیں کہ حقیقت کو اگر چمکتا دمکتا دیکھنا چاہتے ہو تو وہ خورشید حقیقت حضرتِ علی کا خوبصورت چہرہ ہے۔ اس مصرع میں زمین اور آسمانوں کے شعور کے ضمن میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہر شے کی حقیقت کو پانے کے لئے سب سے پہلے اس کا چہرہ دیکھنا ضروری ہے اور زمین اور آسمانوں کے جملہ حقائق کو اگر ایک جگہ مجتمع دیکھنا چاہتے ہو تو وہ حضرت علیؑ کا چہرۂ مبارک ہے۔ اس مرثیے کا دوسرا بند اس مصرع سے شروع ہوتا ہے۔

کہتے ہیں جسے عرش وہ ہے منزل حیدر۔ یہ لیجئے زمین اور آسمانوں کے شعور سے متعلق دوسری اہم چیز عرش ہے۔ یعنی وہ جگہ جہاں سے زمین اور آسمان سب کا سب آسانی کے ساتھ نظر آسکیں تو وہ جگہ اور وہ منزل حضرت علی ہی کی منزل ہے یعنی حضرت علی کی ذات جہاں بھی ہے بس وہی جگہ عرش ہے۔ علی کے پاس آجاؤ علی کے قریب کھڑے ہو جاؤ ان کا عرفان حاصل کرلو تو آپ کو وہیں سے جملہ زمین اور آسمان کا نظارہ ہوسکتا ہے۔ پورا بند اس طرح ہے۔

کہتے ہیں جسے عرش وہ ہے منزل حیدر

خلوت گہ خلاق جہاں ہے دل حیدر
ہر حال میں ہے قدرتِ حق شامل حیدر
ہے نور خدا روشنی ، محفل حیدر
وہ حجت خالق ہے چراغ رہ دیں ہے
پروانہ اسی شمع کا جبریل امیں ہے

میں مزید بند پیش نہیں کرنا چاہتا آپ خود ملاحظہ فرمایئے۔ یہ بند تو آپ کے سامنے ہی ہے۔ اس کے دوسرے مصرع میں میر انیس فرما رہے ہیں کہ دل حیدر میں اس جہاں کا خالق رہتا ہے۔ اور تیسرے مصرع میں ہے کہ اللہ کی قدرت ہرحال میں شامل حیدر ہے یعنی حضرت علی جس حالت میں بھی ہوں قدرت حق کا مظاہرہ ان کی ذات سے ہوتا ہے۔ اور چوتھا مصرع بتا رہا ہے کہ خدا کا نور حضرت علی کی محفل کی روشنی ہے۔ حضرت علی کوئی بات ایسی نہیں کرتے جس میں خدا کا نور نہ ہو۔ اور اس بند کی بیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ علی تو اپنے خالق کی حجت ہے ایک واضح دلیل ہے اور اپنی اسی وضاحت کے باعث وہ دین کے راستے کا چراغ ہے۔ اور اس بیت کے دوسرے مصرع میں ہے کہ علی وہ شمع ہے جس کا پروانہ جبریل امیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ جبریل جو علم و دانش کو نوع بشر تک پہنچانے کا ذمہ دار فرشتہ ہے وہ سے کسب نور کرتا ہے۔ وحی کے رازوں کو علی کی ذات میں وہ آشکار دیکھا ہے۔ اس جگہ جبریل امیں کی ترکیب واضح کر رہی ہے کہ یہ امانت دار فرشتہ حضرت علی کی ذات میں جملہ اسرار وحی کو موجود اور ضو افشاں دیکھ رہا ہے۔ آنحضرتؐ نے علی کی ذات میں جملہ اسرار وحی منتقل کر دیئے ہیں اور پوری امانت اور ضمانت کے ساتھ گویا جس کی گواہی خود جبریل دے رہے ہیں۔

اس مرثیہ کا کمال یہ ہے کہ میر انیس نے اس کا رخ عجیب انداز میں دنیا کے مظلوموں مضموموں اور نادار لوگوں کی طرف موڑا ہے۔ ایک بند ملاحظہ فرمایئے

مضموں کے مظلوموں کے گھر آپ تھے جاتے اور ہاتھ سے اپنے انہیں کھانا تھے کھلاتے
سرواپنے شفقت سے کبھی پاؤں دباتے آہستہ اٹھاتے انہیں آہستہ بٹھاتے
عسرت میں فقیروں کو کھلا آتے تھے اکثر
ننگوں کو ردا اپنی اڑھا آتے تھے اکثر

اس مرثیے میں آگے چل کر طرح طرح کے موڑ آتے ہیں۔ جن میں اس میں زمین اور آسمانوں کا شعور کچھ اپنے ہی انداز میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ جس سے حضرت علی کے دونوں عالم میں مضبوط گرفت کا اظہار ہوتا ہے۔

سید مشکور حسین یاد

کی چند اہم اور قابل مطالعہ تصانیف

- انیس کی شاعرانہ بصیرت
- مطالعہ انیس کے نازک مراحل
- کلام اقبال کے عوامی اُفق
- غالب کی طبع نکتہ جو
- غالب کا ذوقِ الٰہیات
- میرِ بلانوش

خوبصورت، مجلد سفید کاغذ، قیمت فی جلد-

کلاسیک 42-دی مال، لاہور فون: 7312977 فیکس: 7323963